ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام!

سانحہ صفورا نے ایک بار پھر سانحہِ پشاور کے زخم پوری شدت سے ہرے کر دیے ہیں۔ اور یہ زخم تو ابھی مندمل ہی کہاں ہوئے تھے! ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سُرخرو کر کے! محض پانچ ماہ کے وقفے سے ایک اور اتنا بڑا سانحہ۔۔۔ وہ بھی آغا خانی برادری کے ساتھ جو پاکستان میں فلاحی اور رفاہِ عامہ کی خدمات میں سرِفہرست ہے اور قیامِ پاکستان کے وقت سے ملک کے ساتھ وفاداری نبھا رہی ہے۔ یہ واقعہ ایک بار پھر ثابت کر رہا ہے کہ وطنِ عزیز میں دہشت گردی کی موجودہ لہر اندرونی عناصر کی مدد سے ایسے بیرونی ملک دشمن عناصر کی کارروائی ہے جو پاکستان کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بلاتمیزِ مذہب ونسل ہر ایسی جگہ معصوم شہریوں کو نشانہ بنایا جہاں زیادہ سے زیادہ خوف و ہراس پھیلے، جانی نقصان ہو، قوم کا مورال گرے اور پاکستان کی ساکھ خراب ہو۔ پھر اس واقعے کو حسبِ خواہش مخصوص رنگ دینے کی کوشش، کبھی بین المذاہب کبھی فرقہ وارانہ اور کبھی صوبائیت پر مبنی۔

حالیہ واقعہ اس وقت ہؤا جب کہ الحمدللہ پاک فوج کا آپریشن ضربِ عضب کامیابی سے جاری ہے اور اس کے نتیجے میں ملک کے بیشتر حصوں میں دہشت گردی کے واقعات میں کمی آئی ہے۔ فوج کا یہ عزم قابلِ ستائش ہے کہ یہ آپریشن دہشت گردی کے مکمل خاتمے تک جاری رہے گا۔ وزیراعظم اور آرمی چیف کا دورہ کابل ایک اہم اور بروقت اقدام تھا۔ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی پاک افغان مفاہمت کے دُوررس اثرات مرتب ہونے کی توقع ہے۔ ظاہر ہے کہ بھارت کے لیے اس کامیاب پیش رفت کو آسانی سے ہضم کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ دو دن بعد ہی کراچی میں صفوراچورنگی پر یہ بس کا سانحہ پیش آیا جس میں ۴۴ مرد و خواتین بے دردی سے قتل کر دیے گئے۔ تحقیقاتی اداروں کے اکٹھے کیے ہوئے شواہد کے مطابق اس سانحے میں را کے ملوث ہونے کا قوی امکان ہے۔ امید ہے کہ اس بار ہم اصل مجرموں پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور قوم کو حقائق سے آگاہ کیا جائے گا۔

پاکستان میں بین الاقوامی کرکٹ کا احیا پوری قوم کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ملک میں دہشت گردی کے خوف کی فضا اب ختم ہو رہی ہے۔ ہم زمبابوے کی حکومت اور ان کی کرکٹ ٹیم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری بین الاقوامی کرکٹ بحال کرنے میں ہم سے تعاون کیا۔ اب آئندہ ان شاءاللہ جو میچ دبئی، شارجہ اور ابوظہبی میں کھیلے جاتے تھے وہ لاہور کراچی اور راولپنڈی میں کھیلے جائیں گے، پاکستان کی ساکھ میں اضافہ ہو گا اور عزت افزائی ہو گی۔

روہنگیا کی مظلوم مسلمان آبادی کے لیے اوسلو (ناروے) کے نوبیل انسٹی ٹیوٹ میں ہونے والی کانفرنس میں سولہ ممالک اور چار مذاہب کے نمائندوں نے شرکت کی۔ سات نوبیل انعام یافتگان بھی موجود تھے۔ مشترکہ اعلامیہ میں اس کو روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی اور انسانیت کا بدترین قتلِ عام قرار دیا گیا اور اقوامِ متحدہ سمیت دیگر عالمی اداروں اور تنظیموں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی۔ اللہ کرے ان کوششوں کا کوئی ٹھوس نتیجہ نکلے اور برما کے مسلمان ظلم سے نجات اور اپنے انسانی حقوق کی ضمانت پا سکیں۔

رمضان المبارک آن پہنچا ہے۔۔۔ صبر اور بے بہا اجر کا مہینہ۔۔۔ جشنِ قرآن کا مہینہ۔۔۔ ہدایت کی نعمت عطا ہونے پر اللہ کی بڑائی کے اقرار کا مہینہ۔۔۔ احساس اور سوچ بچار کا، ندامت اور اظہار کا، قربانی اور ایثار کا مہینہ۔۔۔ جسم کی صحت اور روح کی بالیدگی کا۔۔۔ بہت کم وقت میں بہت زیادہ حاصل کر لینے کا موقع، جو سال بھر میں صرف ایک بار آتا ہے۔۔۔ مقبول دعاؤں اور قربِ الٰہی کا ایک اور نادر موقع یعنی شبِ قدر کا تحفہ اپنے دامن میں لیے۔۔۔ اللہ کرے ہم سب اس سے حتی المقدور فیض یاب ہو سکیں آمین۔ نورین طلعت عروبہ کی زبانی:

ہمیں خبر ہے کہ کیا راستہ ہمارا ہے
گزر رہے ہیں مگر انحراف کرتے ہوئے
ندامتوں بھرے دل کو کرم کی آس بھی ہے
تری جناب میں ہر اعتراف کرتے ہوئے

نزولِ قرآن کی نسبت سے یہ ماہ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت، تفہیم اور تدبر کا متقاضی ہے۔ یہ وہ کلام ہے جس نے عرب کے جانی دشمن قبائل کے دل جوڑ دیے تھے اور انہیں ایک راہ کے مسافر بنا دیا تھا۔ اہلِ یثرب نے اپنی نہ ختم ہونے والی دشمنیوں، بدامنی اور قتل و غارت گری سے تھکی ہوئی زندگی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر نبیؐ رحمت کو اپنے ہاں آنے کی درخواست کی تھی اور پھر تاریخ نے ان کے اس فیصلے کو نہ صرف ان کے بلکہ ساری انسانیت کے حق میں بہترین ثابت کیا۔ اسی کتاب کی رہنمائی میں پیغمبرِ اسلام نے اہلِ کتاب اور مشرکین سے معاہدے کیے، مشترکات کی طرف بلایا، باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کا تعاون حاصل کیا اور چند برسوں میں اسلام کو ایک غالب قوت بنا دیا۔ یہ وہ کتاب ہے جو صرف اہلِ ایمان کے نہیں، ساری انسانیت کے دل جوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے، انسانیت کے دکھوں کا مداوا کر سکتی ہے اور اپنے دامن میں آنے والوں کو امن و سلامتی کی ضمانت دیتی ہے۔ ہمارے لیے تو جشنِ قرآن کا یہ ماہ مبارک ماہِ آزادی بھی ہے۔ ہم نے اپنے دستور میں یہ اقرار و اعلان کر رکھا ہے کہ قرآن و سنت ہماری قومی زندگی کی رہنمائی کریں گے۔ یہ موقع اسی عزم کو دہرانے کا ہے کہ ہم اس کتاب کی رہنمائی میں اپنے سب انفرادی و اجتماعی معاملات کو درست کریں گے ان شاء اللہ۔

پچھلے ماہ کا اعلان دہرا دیں کہ پرچہ موصول نہ ہونے کی شکایت کا حل رجسٹرڈ ڈاک ہے جس کا خرچ قدرے زیادہ آتا ہے۔ ہمارے وہ معزز خریدار جن کو یہ شکایت اکثر رہتی ہے وہ دو سو روپے سالانہ زیادہ ادا کر کے پرچہ رجسٹرڈ منگوا لیں اور اس زحمت سے بچ جائیں۔ پرچے پر مینیجر صاحب کا فون نمبر درج ہے جس کے ذریعے آپ اپنا خریداری نمبر نوٹ کروا سکتے ہیں۔

امجد اسلام امجد کے ان اشعار کے ساتھ اجازت:

جیسے میں دیکھتا ہوں لوگ نہیں دیکھتے ہیں
ظلم ہوتا ہے کہیں اور کہیں دیکھتے ہیں
جھوٹ اور سچ کی نشانی بھی نہیں پاس ان کے
ہر حقیقت کو مگر اپنے تئیں دیکھتے ہیں
سرسراہٹ ہے نہ آہٹ ہے نہ چوڑی کی کھنک
کس سلیقے سے ہمیں پردہ نشیں دیکھتے ہیں
تیر آیا تھا جدھر سے ، یہ مرے شہر کے لوگ
کتنے سادہ ہیں کہ مرہم بھی وہیں دیکھتے ہیں
بھولتے جاتے ہیں طاقت کے جنوں میں کیا کچھ
اپنے بھی نقشِ قدم لوگ نہیں دیکھتے ہیں

دعا گو

صائمہ اسما

مولانا یوسف اصلاحی

قرآن کو سمجھ کر پڑھیے

رمضان کا مہینہ خاص طور پر دلوں کی صفائی، روح کی ترقی اور نفس کے تزکیے کا مہینہ ہے۔ یوں تو اس مہینہ کی ساری ہی عبادتیں روزہ، صدقہ، تراویح، تلاوت قرآن اور اعتکاف اسی لیے ہیں کہ دل ہر طرح کی کدورت اور گناہوں کے زنگ سے صاف ہو کر آئینے کی طرح شفاف اور مجلی ہو جائے۔ مگر خاص طور پر قرآن پاک کی تلاوت قلب کی صفائی اور جلا کے لئے مئوثر ترین اور یقینی ذریعہ ہے۔ آپ ؐ کا ارشاد ہے:

ان هذه القلوب تصدء كما يصدء الحديد اذا اصابه الماء قيل يا رسول الله وما جلاء ها؟ قال كثرة ذكر الموت و تلاوة القراٰن (مشکوٰۃ)

(یہ انسانی قلوب بھی زنگ آلو ہو جاتے ہیں جس طرح لوہے کو پانی سے زنگ لگ جاتا ہے۔ پوچھا گیا، اے اللہ کے رسول! پھر دلوں کے زنگ کو دور کرنے والی اور جلا بخشنے والی چیز کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: کثرت سے موت کی یاد اور قرآن پاک کی تلاوت)

رمضان میں خاص طور پر مسلمان تلاوت قرآن کا اہتمام کرتے ہیں، شب کی تاریکی میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر تراویح میں قرآن پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ مسلمانوں کی ہر بستی میں عام طور پر اس کا اہتمام اور انتظام ہوتا ہے۔ تراویح کے علاوہ بھی اس مبارک مہینے میں قرآن پاک پڑھنے پڑھانے کا اہتمام ہوتا ہے اور اس میں کسی تذبذب اور شک کی کوئی گنجائش قطعاً نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اپنے قلوب کو ہر طرح کی اخلاقی کدورت اور گناہوں کے زنگ سے صاف کرنے کا یقینی طور پر صحیح طریقہ اپنا رکھا ہے۔

حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس عمل سے مسلمانوں کو انتہائی شغف بھی ہے، نہایت ذوق وشوق سے اس کا اہتمام اور التزام بھی ہے، لیکن دلوں کی صفائی نہیں ہو رہی ہے، ان کا زنگ دور نہیں ہو رہا ہے۔ قرآن پاک پڑھنے پڑھانے کا اس قدر اہتمام ہے لیکن پھر بھی دلوں میں حرص، لالچ، کینہ، بغض، نفاق اور کدورتیں موجود ہیں۔ خاندانی جھگڑے، ایک دوسرے سے نفرت وعناد، دوسرے کے حقوق سے غفلت، ماں اور باپ کی نافرمانی، اولاد کے حقوق سے لاپروائی، غرض طرح طرح کی کوتاہیوں اور گناہوں کے زنگ سے دل آلودہ ہیں۔ قلب کی صفائی، خوش گوار تعلقات، تزکیہ نفوس کے آداب اور زنگ بیان کرنے والوں کی تو کوئی کمی نہیں۔ لیکن عملی طور پر قلوب بدستور زنگ آلود رہتے ہیں۔ آخر تلاوت قرآن سے قلوب کی جلا اور صفائی کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ رسول صادق ﷺ کا ارشاد یقیناً حق ہے، اصل بات یہ ہے کہ تلاوت کا مفہوم نہیں سمجھا جا رہا ہے اور اسی لیے تلاوت قرآن قرآن کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے۔ تلاوتِ قرآن کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ آپ قرآن کے الفاظ کو توجوں توں زبان سے ادا کر لیں اور آپ کچھ نہ سمجھیں کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ اپنی کن ذمہ داریوں کو تازہ کر رہے ہیں اور ان ذمہ داریوں کا کس حد تک آپ کو پاس ولحاظ ہے۔

تلاوتِ قرآن کا مفہوم ہے قرآن کو صحیح صحیح پڑھنا، اس کی تعلیمات پر غور کرنا، اس کے احکام کو سمجھنا، اس کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کرنا۔ ساتھ ہی قرآن کی تلاوت کا یہ بھی مفہوم ہے کہ اس کی اشاعت کی جائے۔ اس کی تعلیمات دوسروں تک پہنچائی جائیں۔ قرآن وسنت پر آپ غور فرمائیں گے تو اس مفہوم پر آپ کو شرح صدر ہو گا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ط اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (البقرہ ۲:۱۲۱)

ترجمہ: ''وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ کتاب کی تلاوت کا واقعی حق ادا کرتے ہیں اور یہی لوگ حقیقت میں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں دو باتیں قابل غور ہیں۔پہلی بات تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔''جن کو ہم نے کتاب دی۔'' پورے قرآن میں جہاں جہاں اہل کتاب کو کتاب دینے کا ذکر آیا ہے ان سب آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں دو گروہ ہیں اور ان دونوں گروہوں کا ذکر اللہ تعالیٰ الگ الگ انداز سے کرتا ہے۔اہل کتاب کے اس گروہ کا جب ذکر فرماتا ہے جو کتاب کے محافظ رہے اور اس پر عمل کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ کتاب دینے کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے اور کہتا ہے۔اٰتَیۡنٰھُمُ الۡکِتٰبَ ''ہم نے ان کو کتاب دی۔'' اور جب اس نافرمان گروہ کا ذکر کرتا ہے جس نے کتاب کو ضائع کر دیا تو اپنی طرف نسبت نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے اُوۡتوا الۡکِتٰبَ ''وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی تھی' (مگر انہوں نے ضائع کر دی)۔'' اس تفصیل کو نگاہ میں رکھ کر اوپر کی آیت پر غور کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ تلاوت کتاب کا حق وہی ادا کرتے ہیں جو واقعی اس کے حامل اور امین ہیں۔ان لوگوں کی تلاوتِ کتاب کی کوئی حیثیت نہیں ہے جو اس پر کاربند نہیں ہے اور جن لوگوں نے اسے ضائع کر دیا ہے۔

دوسری بات آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ تلاوتِ کتاب کا حق ادا کرنے والے ہی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔یہ انتہائی اہم بات ہے اور یہ رک کر سوچنے کا مقام ہے۔قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو لوگ کتاب کی حفاظت کرتے ہیں، اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں، وہی لوگ اس پر ایمان کے دعوے کے سچے ہیں۔یہی بات اللہ کے رسول ﷺ نے اس انداز میں بیان فرمائی ہے۔غور کیجئے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ماامن بالقران من استحل محارمه (ترمذی)

''وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں رکھتا جس نے اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر رکھا ہے۔''

یعنی قرآن پر ایمان کے دعوے میں وہی شخص سچا ہے جو قرآن کے قانون حلال وحرام کو تسلیم کرتا ہے اور عملی زندگی میں اس پر کاربند رہنے کی مخلصانہ کوشش کرتا ہے۔اس شخص کے ایمان بالقرآن کا کیا اعتبار جو قرآن کے حلال وحرام سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارے۔ایسا شخص اگر قرآن پاک کی آیتیں دہرا رہا ہے اور رمضان کی مبارک ساعتوں میں اس کے پڑھنے سننے کا اہتمام کر رہا ہے تو اس کا یہ عمل وہ عمل نہیں ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔وہ یقیناً تلاوتِ قرآن کا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔اس کی تلاوت وہ تلاوت نہیں ہے جس کا قرآن نے حکم دیا ہے اور جس کی تاکید نبی ﷺ نے اُمت کو فرمائی ہے۔

قرآن پاک کی ایک اور آیت پر غور کیجئے۔حضرت ابراہیمؑ نے آخری نبی کی بعثت کے لئے جو دعا کی تھی اس میں رسول خاتم ﷺ کے چار کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُزَکِّیۡهِمۡ (البقرہ،۲:۱۲۹)

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھا جو انہیں تیری آیات پہنچائے۔ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کو سنوارے۔''

۱۔تلاوت آیات،۲۔تعلیم کتاب،۳۔تعلیم حکمت،۴۔تزکیہ

اور ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ یہاں تلاوت آیات سے مراد قرآن کی آیات وتبلیغ اور اس کی تعلیمات کو سنانا اور پہنچانا ہے۔ایک اور موقع پر نبی اللہ کو ہدایت دی گئی ہے:

وَاتۡلُ مَآ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ کِتَابِ رَبِّکَ (الکھف، ۱۸:۲۷)

''اور اے رسول! تمہارے رب کی جو کتاب تم پر نازل کی جا رہی ہے اسے ان لوگوں تک پہنچا دو۔''

قرآن وسنت کی ان تشریحات سے تلاوت قرآن کا جو مفہوم واضح ہوتا ہے اس مفہوم میں تلاوت ہی دراصل تلاوت قرآن ہے اور یہ تلاوت قرآنی وہی شخص کر سکتا ہے اور اسی کو زیب بھی دیتا ہے جس کی اپنی زندگی قرآن تعلیمات کا صحیح نمونہ ہو۔وہ علمی اور فنی لحاظ سے چاہے اس کی

باریکیاں اور نکتے نہ بیان کرسکتا ہو، لیکن اپنی زندگی میں اخلاص، یکسوئی اور شغف کے ساتھ قرآن کے احکام پر عمل کر رہا ہو اور جس کو اس یقین کی دولت حاصل ہو کہ قرآن ہی اس کے لیے دنیا اور آخرت کی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ ہے۔ اس یقین سے محروم اور اس عمل سے بے بہرہ انسان اگر قرآن پڑھ رہا ہے یا سن رہا ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تلاوت قرآن کا وہ عظیم فائدہ حاصل کر رہا ہے اور اسے تلاوت قرآن کا وہ عظیم فائدہ حاصل ہوسکتا ہے جس کو نبی ﷺ نے تلاوت قرآن کا لازمی فائدہ بتایا ہے۔

قرآن پاک کی ان آیات کے ساتھ اگر نبی ﷺ کی وہ حدیثیں بھی سامنے رہیں جن میں تلاوت قرآن کی ہدایت کی گئی ہے تو یہ حقیقت اور زیادہ نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت عبیدہ ملیکیؓ کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اے قرآن کے ماننے والو! قرآن کو تکیہ نہ بنالینا، شب و روز کی گھڑیوں میں اس کی تلاوت کا حق ادا کرنا، اس کی اشاعت اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو رواج دینا۔ اس کے الفاظ کو صحیح صحیح ادا کرنا اور اس پر غور و فکر کرتے رہنا، تاکہ تم کامیاب ہو اور جلد بازی کر کے اس کے ذریعے دنیا کا صلہ مت چاہنا، اللہ کی خوشنودی کیلیئے اس کی تلاوت کرنا کہ آخرت میں اس کا صلہ لازمی ہے۔'' (مشکوٰۃ)

قرآن کو تکیہ بنانے سے مراد ہے اس سے غفلت برتنا اور اس کی طرف سے لاپروا ہو جانا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی ''قرآن کی تلاوت کا حق ادا کرنا اور پھر آگے آپ ﷺ نے حق تلاوت ادا کرنے کی تشریح میں چار باتیں بیان فرمائی ہیں:۔

۱۔ قرآن کی اشاعت اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو رواج دینا۔

۲۔ اس کے الفاظ کو صحیح ادا کرنے کا اہتمام کرنا۔

۳۔ قرآن پر غور و فکر اور تدبر کرنا۔

۴۔ اور آخری بات یہ کہ یہ عمل خالص رضائے الٰہی اور اجرِ آخرت کے لیے کرنا، دنیوی صلے کی طلب سے اپنے دل کو پاک رکھنا۔

ایک بار حضرت ابوذرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی یارسول اللہ! مجھے وصیت فرمایئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ کا تقویٰ تمہارے دین و دنیا کے سارے معاملات سدھارنے اور سنوارنے والی چیز ہے۔'' حضرت ابوذرؓ نے درخواست کی کہ حضور کچھ اور وصیت فرمایئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تلاوت قرآن اور اللہ کا ذکر پابندی سے کرتے رہنا۔ اس کے ذریعہ آسمان والوں میں تمہارا ذکر اور چرچا ہوگا اور یہ عمل زندگی کی تاریکیوں میں تمہیں روشنی کا کام دے گا۔'' (مشکوٰۃ)

قرآن و سنت کی نظر میں قرآن سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جو بے سوچے سمجھے اس کے الفاظ دہراتے ہیں اور اس کی ہدایات اور تعلیمات سے غافل و بے نیاز ہو کر کوئی ذمہ داری محسوس کیئے بغیر قرآن پڑھنے سننے اور ختم کرنے کرانے ہی کو کارنامہ سمجھتے ہیں۔ دین کی نظر میں قرآن والے وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی میں قرآن پر عمل کرتے ہیں، اس کو اپنی زندگی کا دستور بناتے ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

یوتی بالقران یوم القیامة واھله الذین کانو یعملون به فی الدنیا تقدمه سورة البقره وال عمران...... تحاجان عن صاحبهاَ

(قیامت کے روز قرآن اور قرآن کے ماننے والے جو دنیا کی زندگی میں اس پر عمل کرتے تھے اللہ کے حضور لائے جائیں گے۔ اس وقت سورۂ البقرہ اور سورۂ آل عمران پورے قرآن کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے عمل کرنے والے کے لیے رب سے سفارش کریں گی کہ پروردگار یہ بندہ تیری رحمت و مغفرت کا مستحق ہے۔

اس حدیث میں قرآن کو ماننے والے کی تشریح خود نبی ﷺ نے جن لفظوں میں فرمائی وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فرمایا: **الذین امنوا کانوا یعملون به فی الدنیا** (وہ لوگ جو دنیا کی زندگی میں قرآن پر عمل کرتے تھے) یعنی قرآن کو ماننے والے حقیقت میں وہی ہیں جو دنیا کی زندگی میں اس پر عمل کرتے ہیں۔ بے شک مسلمان معاشرے میں

آج بھی رمضان کی مبارک راتوں میں قرآن پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کا خاصا رواج ہے اور بعض بستیوں میں تو اس کا بڑا چرچا رہتا ہے لیکن جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس عمل خیر کا جو فائدہ بتایا ہے وہ بھی حاصل ہو رہا ہے یا نہیں تو مایوسی ہونے لگتی ہے اور یہ خوش گمانی محض فریب نظر آتی ہے کہ مسلمان معاشرے میں تلاوت قرآن کا اہتمام اور رواج ہے۔ مسلمان قرآن پڑھتے پڑھاتے تو ہیں لیکن وہ تلاوت قرآن کے اس مفہوم اور مقصود سے نا آشنا ہیں جو قرآن وسنت نے بتایا ہے اور ان کی تلاوت وہ تلاوت قرآن نہیں ہے جس کی تاکید اللہ اور رسول ﷺ نے فرمائی ہے:

البتہ ایک بات نہایت وضاحت وصراحت کے ساتھ قطعی طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کو یہ امتیازی مقام حاصل ہے کہ محض اس کے الفاظ کو دہرانا اور بغیر سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعث ثواب ہے۔ یہ بات جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو بغیر سمجھے پڑھنالا حاصل ہے یا یہ کہتے ہیں کہ محض الفاظ دہرانے سے یہ بہتر ہے کہ آدمی کسی زبان میں ترجمہ ہی پڑھ لے، قطعاً غلط اور گمراہ کن طرزفکر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کو بے سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعث اجرو ثواب ہے۔ اور یہ کوئی خود تراشیدہ دعویٰ نہیں ہے بلکہ اللہ کے رسولِ صادق وامین کا صاف صاف ارشاد ہے:

عن ابن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم من قرء حرفا من كتاب الله فله حسنة والحسنة بعشر امثالها لا اقول الم حرف الف حرف ولام حرف وميم حرف (ترمذی)

عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(جس نے اللہ کی کتاب میں سے ایک حرف پڑھا اس کے لیے ایک نیکی ہے اور نیکی کا اجر دس گنا ہوا کرتا ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے)

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ حقیقت سمجھانے کے لیے کہ بے سوچے سمجھے قرآن پڑھنے کا بھی اجر وثواب ہے، نہایت واضح اور قطعی مثال کا انتخاب فرمایا۔ آپ نے یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کے لیے **یعلمون تعلمون** اور **علیم و خبیر** جیسے الفاظ منتخب نہیں فرمائے۔ اس لیے کہ ان کا مفہوم عام ہے۔ آپ نے حروف مقطعات کا انتخاب فرمایا جن کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ان کا مفہوم اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور پھر آپ نے **الم** کا انتخاب فرما کر اس کے بھی الگ الگ حرف کر کے بتایا کہ الف کا الگ اجر ہے اور لام کا الگ اجر ہے اور میم کا الگ اجر ہے کہ اگر حروف کا کوئی مفہوم متعین کرے، تو اس کے الگ الگ حرفوں کا مفہوم اور مطلب متعین کرنے اور اس کی طرف کسی کا ذہن بھی منتقل نہ ہوگا اور اس طرح آپ نے یہ حقیقت قطعی طور پر ذہن نشین کرائی کہ بے سمجھے پڑھنا بھی اجر وثواب کا کام ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے بے پڑھے لوگ نماز میں سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھتے ہیں اور اس کے مطلب سے ناواقف ہوتے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی نماز نہیں ہوتی، یا ان کو نماز کا اجر وثواب نہیں ملتا۔ ان کی نماز بھی سب کے نزدیک درست ہے اور یقیناً یہ لوگ اجر و ثواب کے بھی مستحق ہوں گے۔

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنے بچوں کو ناظرہ قرآن بڑی عقیدت، ذوق وشوق اور للّٰہیت کے ساتھ پڑھاتے ہیں۔ حفظ کراتے ہیں، پورا حفظ نہیں کرا پاتے تو چند سورتیں ضرور یاد کراتے ہیں۔ خود سنتے ہیں، دوسروں کو سنواتے ہیں، اس پر خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں اور بجا فخر کرتے ہیں، قرآن اللہ کا کلام ہے اور یہ امتیاز صرف اللہ کے کلام ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ کے کلام میں جو جوش، ایمان کو گرمانے کی تاثیر اور تسخیر کی شان ہے وہ دنیا میں کسی کلام کو حاصل نہیں۔ اسی لیے اس کا پڑھنا بھی عبادت اور حفظ کرنا بھی عبادت ہے اور دنیا میں اسی تصور اور یقین کے ساتھ کروڑوں بچے ناظرہ قرآن پڑھتے یا حفظ کرتے ہیں اور رمضان کی روشن راتوں میں تراویح کی نماز میں قرآن سناتے ہیں اور سننے والے عقیدت و دل بستگی اور ذوق کے ساتھ سنتے ہیں اور اللہ سے اس عبادت کے اجر وثواب کی توقع رکھتے ہیں۔

اس گفتگو کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں بے سوچے سمجھے قرآن پڑھنے کی تلقین کر رہا ہوں یا ان لوگوں کے غلط مقصد کو تقویت پہنچا رہا ہوں جو قرآن کو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھنے کو عام مسلمانوں کے لیے غلط اور مضر بتاتے ہیں اور محض الفاظ دہرانے اور بے سوچے سمجھے تلاوت کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔اصل میں اس ضمن میں ایک ضروری بات جو سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ناظرہ قرآن کی تعلیم حاصل کرنا قرآن کے حقوق ادا کرنے کی جانب پہلا قدم ہے۔سب سے بڑی غلطی یہ ہو رہی ہے کہ ناظرہ قرآن کی تعلیم کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کی تعلیم کا یہ عمل یہیں رُک نہ جائے بلکہ ناظرہ قرآن اور حفظ کی صلاحیت حاصل کرنے کے بعد قرآن کے معانی اور مطالب کی تفہیم و تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے اور یہ سلسلہ جاری رکھا جائے۔اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ان اداروں پر عائد ہوتی ہے جو ناظرہ قرآن کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ناظرہ قرآن کے اجر والی احادیث کو ان آیات قرآنی اور احادیث کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے جن میں قرآن کو سمجھنے اس پر عمل کرنے اور اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے یہ سب احکام ناظرہ قرآن پڑھنے کی نفی نہیں کرتے بلکہ اس کیلئے زیادہ مواقع فراہم کرتے ہیں۔

درحقیقت امت نے اس قرآن کے ساتھ یہ نہایت غلط سلوک اور انتہائی زیادتی کی ہے کہ اس کو سمجھنے سمجھانے میں غور و تدبر کرنے اور اس کے احکام اور تعلیمات پر عمل کرنے کی عادت بڑی حد تک ختم کر دی ہے۔حالانکہ قرآن نے بار بار اس کی ہدایت فرمائی ہے یہی اس کا مقصد نزول بتایا ہے۔خود رسول اللہ ﷺ نے مختلف انداز سے اس کی ترغیب دی اس کے مواقع پیدا فرمائے اور مجلسوں میں اس طرح کے سوالات ابھارے کہ لوگوں میں قرآن پاک پر غور و فکر کا جذبہ ابھرے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینھم الانزلت علیھم السکینۃ وغشیتھم الرحمۃ وحفتھم الملائکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ (ابوداؤد)

(جب بھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوں، اللہ کی کتاب کی تلاوت کریں اور باہم اس کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کریں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے۔رحمتِ الٰہی ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اللہ ان کا تذکرہ اپنے پاس کے لوگوں میں کرتا ہے)

☆☆☆

میری محسن کتاب......قرآن مجید

میں قدیم و جدید فلسفہ، معاشیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں۔مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا،علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے، جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، پھر بھی حل نہ کر سکے۔انہیں اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے۔

میری اصلی محسن بس یہی ایک کتاب ہے۔اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی۔ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔انگریزی میں اس کنجی کو ’’Master Key‘‘ (شاہ کلید) کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے، سو میرے لیے یہ قرآن ’شاہ کلید‘ ہے مسائلِ حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں، وہ کھل جاتا ہے۔جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکر ہے اس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

مولانا سیّد ابوُ الاعلیٰ مودُودیؒ

عظمیٰ پروین

فلاح کی راہ

ہوشیار اور توانا وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے اور نادان و ناتواں وہ ہے جو اپنے کو خواہشات کا تابع کر دے اور اللہ سے امیدیں باندھے (ترمذی، ابن ماجہ)

فلاح پا گیا وہ بندہ جس کو حقیقتِ ایمان نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدر کفاف ملی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدر قلیل روزی پر قانع بھی بنا دیا۔ (مسلم)

جو شخص ڈرتا ہے وہ شروع رات میں چل دیتا ہے اور جو شروع رات میں چل دیتا ہے وہ عافیت کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ یاد رکھو اللہ کا سودا سستا نہیں۔ بہت مہنگا اور بہت قیمتی ہے۔ یاد رکھو اللہ کا وہ سودا جنت ہے۔ (ترمذی)

عرض کیا گیا ''نجات حاصل کرنے کا کیا گر ہے؟'' فرمایا: ''اپنی زبان پر قابو رکھو اور چاہیے کہ تمہارے گھر میں تمہارے لئے گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر اللہ کے حضور رویا کرو۔ (ترمذی)

مجھ سے زیادہ قریب اور مجھ سے زیادہ تعلق رکھنے والے وہ سب بندے ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں وہ جو بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں۔ (مسند احمد)

میری امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے وہ بندگانِ خدا ہوں گے جو منتر نہیں کراتے، شگون بد نہیں لیتے اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

جانتے ہو قیامت کے روز کون لوگ سب سے پہلے پہنچ کر اللہ کے سایہ میں جگہ پائیں گے؟ عرض کیا گیا ''اللہ اور اللہ کا رسولؐ ہی زیادہ جانتا ہے، فرمایا: ''وہ جن کا حال یہ تھا کہ جب ان کے آگے حق پیش کیا گیا انہوں نے قبول کر لیا، جب ان سے حق مانگا گیا انہوں نے ادا کر دیا اور دوسروں کے معاملہ میں ان کا فیصلہ وہی کچھ تھا جو اپنی ذات کے معاملہ میں تھا (مسند احمد)

عبداللہؓ بن مسعود نے پوچھا ''خدا کو کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے؟'' فرمایا: ''وہ نماز جو وقت پر پڑھی جائے'' عرض کیا ''اس کے بعد کونسا عمل خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟'' فرمایا ''ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک'' عرض کیا اس کے بعد فرمایا ''خدا کی راہ میں جہاد کرنا'' (بخاری و مسلم)

صاحب ایمان بندہ اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتے ہوں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں (ابوداؤد)

تم جہاں اور جس حال میں ہو خدا سے ڈرتے رہو اور ہر برائی کے پیچھے نیکی کرو وہ اس کو مٹا دے گی اور اللہ کے بندوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ (مسند احمد، ترمذی)

ایمان کی حلاوت اس شخص کو نصیب ہو گی جس میں تین باتیں پائی جائیں گی ایک یہ کہ اللہ و رسولؐ کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ جس آدمی سے بھی اس کو محبت ہو صرف اللہ ہی کے لیے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹنے سے اس کو اتنی نفرت اور ایسی اذیت ہو جیسی آگ میں ڈالے جانے سے ہوتی ہے۔ (بخاری و مسلم)

معاذؓ بن جبل نے افضل ایمان کے متعلق سوال کیا۔ فرمایا: ''یہ کہ بس اللہ ہی کیلئے تمہاری کسی سے محبت ہو اور اللہ ہی کے واسطے بغض و عداوت ہو اور دوسرے یہ کہ اپنی زبان کو تم اللہ کی یاد میں لگائے رکھو۔ عرض کیا اور کہا یا رسولؐ اللہ! فرمایا ''دوسرے لوگوں کیلئے بھی وہی چاہو جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔ (مسند احمد)

آدمی کے اسلام کی خوبی اور اس کے کمال میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید کاموں اور باتوں کا تارک ہو (ابن ماجہ، ترمذی)

جو روپے پیسے اور کپڑے لتے کا بندہ ہے وہ بدبخت ہے۔ اگر

اسے دیا جائے تو خوش، اگر نہ دیا جائے تو ناخوش یہ بدبخت ہو اور ٹھوکر کھائے، اگر اسے کانٹا لگے تو نہ نکالا جائے، خوشخبری ہو اس بندے کو کہ اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ہے۔ پراگندہ سر، خاک آلود قدم، اگر پہرے پر ہے تو پہرے پر، اگر فوج کے پچھلے حصے میں ہے تو اسی میں اپنی ذمہ داری نبھا رہا ہے۔ اگر رخصت مانگے تو رخصت نہ ملے اور اگر سفارش کرے تو قبول نہ کی جائے۔ (بخاری شریف)

جو کوئی اللہ کو راضی کرنا چاہے لوگوں کو اپنے سے خفا کر کے تو اللہ مستغنی کر دے گا اس کو لوگوں کی فکر اور بار برداری سے اور خود اس کے لئے کافی ہو جائے گا اور جو کوئی بندوں کو راضی کرنا چاہے گا اللہ کو ناراض کر کے تو اللہ اس کو سپرد کر دے گا لوگوں کے۔ (ترمذی)

اللہ کے خوف اور ہیبت سے جس بندہ مومن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلیں اگرچہ وہ مقدار میں بہت کم مثلاً مکھی کے سر برابر ہوں۔ پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرہ پر پہنچ جائیں تو اللہ اس چہرے کو آتش دوزخ کے لئے حرام کر دے گا۔ (سنن ابن ماجہ)

اللہ سے ایسی حیا کرو جیسی اس سے حیاء کرنی چاہیے عرض کیا گیا ''الحمدللہ ہم خدا سے حیا کرتے ہیں۔ فرمایا یہ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو افکار و خیالات ہیں ان سب کی نگہداشت کرو، اور پیٹ اور جو کچھ اس میں بھرا ہوا ہے اس سب کی نگرانی کرو اور موت اور موت کے بعد قبر میں تمہاری جو حالت ہونی ہے اس کو یاد رکھو، جس نے یہ سب کیا سمجھو کہ اس نے اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کیا۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اس متقی دولت مند بندہ سے جو نامعروف اور چھپا ہوا ہو۔ (مسلم)

جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اس کو صابرین اور شاکرین میں لکھیں گے، جس کی یہ عادت ہو وہ دین کے معاملے میں اللہ کے ان بندوں پر نظر رکھے جو اس سے فائق اور بالاتر ہوں اور ان کی پیروی کرے اور دنیا کے معاملے میں ان غریب و مسکین اور خستہ حال بندوں پر نظر رکھے جو دنیوی حیثیت سے اس سے بھی کم تر ہوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے ان بندوں سے زیادہ دنیا کی نعمتیں اس کو دے رکھی ہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صابر و شاکر لکھا جائے گا اور جس کا حال یہ ہو کہ دین کے بارے میں تو ہمیشہ اپنے سے ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو دیکھے اور دنیا کے بارے میں اپنے سے بالاتر لوگوں پر نظر کرے اور جو دنیاوی نعمتیں اس کو نہیں ملی ہیں ان کے نہ ملنے پر افسوس اور رنج کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صابر و شاکر نہیں لکھا جائے گا۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ خود مہربان ہے اور نرمی و مہربانی کرنا اس کو محبوب بھی ہے اور نرمی پر اتنا دیتا ہے جتنا درشتی اور سختی پر نہیں دیتا اور نرمی کے ماسوا کسی چیز پر نہیں دیتا۔ (مسلم)

حضرت عائشہؓ نے ایت وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ کے بارے میں دریافت کیا کہ: کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ نبیؐ نے فرمایا: اے میرے صدیقؓ کی بیٹی نہیں! بلکہ وہ اللہ کے وہ خدا ترس بندے ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقہ و خیرات کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی یہ عبادتیں قبول نہ کی جائیں یہی لوگ بھلائیوں کی طرف تیزی سے دوڑتے ہیں۔ (ترمذی وابنِ ماجہ)

ہر مرنے والے کو حسرت ہوگی عرض کیا گیا یارسولؐ اللہ! اس کو حسرت کیوں ہوگی؟ فرمایا: ''اگر وہ نیکوکار ہوگا تو اس کو ندامت ہوگی کہ اس نے نیکوکاری میں اور زیادہ ترقی کیوں نہیں کی اور اگر وہ بدکار ہوگا تو اس کو اس کی ندامت ہوگی کہ وہ بدکاری سے باز کیوں نہیں رہا۔ (ترمذی)

نبیؐ ایک جوان کے پاس اس کے آخری وقت میں پہنچے اور پوچھا اس وقت تم اپنے کو کس حال میں پاتے ہو۔ اس نے عرض کیا یارسولؐ اللہ! میرا یہ حال ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید بھی رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا بھی ہوں۔'' فرمایا: ''جس کے دل میں امید اور خوف کی یہ دونوں کیفیتیں ایسے عالم میں (یعنی موت کے وقت) جمع ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ ضرور عطا فرما دیں گے جس کی اس کو اللہ کی رحمت سے امید ہے اور اس عذاب سے اس کو ضرور محفوظ رکھیں گے جس کا اس کے دل میں خوف ہے۔ (ترمذی)

☆......☆......☆

محمد صفدر بشیر

استقبالِ رمضان

اپنے اردگرد ہم نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے دوست احباب، عزیز و اقارب میں سے اکثر جو گزشتہ سال ہمارے درمیان تھے۔ اس سال ہم میں موجود نہیں ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی مہلت عمل پوری کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اللہ جانے کہ آئندہ سال ہم بھی اس دنیا میں موجود ہوں گے یا نہیں...... اور کون جانے کہ اس سال بھی یہ برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ بھی مکمل کر پاتے ہیں یا نہیں...... لہٰذا کیوں نہ امسال اس ماہِ مبارک کی برکتوں اور رحمتوں کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کی جائے اور اس ماہِ مبارک کو شعوری طور پر گزارا جائے۔

شعوری طور سے میری مراد یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جس طرح سال کے دیگر مہینے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں اور ہم پر ماسوائے دنیاوی نفع و نقصان کے اثرات کے اور کچھ نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح ہم اس عظیم مہینے کو بھی معمول (روٹین) کے طور پر ہی گزار دیں بلکہ گنوا دیں۔

اس مہینے کی نعمتوں، برکتوں اور رحمتوں سے اپنا اپنا دامن بھرنے کے لیے اگر ہم شعوری طور پر تھوڑی سی تیاری کر لیں اور اسے باقاعدہ ایک پروگرام کے تحت گزاریں تو یقیناً ہم اس کی برکتوں سے مستفید بھی ہوں گے اور یہ ماہِ مبارک ہم پر اخلاقی و روحانی اثرات بھی چھوڑ کر جائے گا۔

اس سلسلے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خطبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جو آپؐ نے شعبان کی آخری شب دیا اور جسے حضرت سلمان فارسیؓ نے اس طرح نقل فرمایا:

''اے لوگو! ایک بڑی عظمت والا بڑی برکت والا مہینہ قریب آ گیا ہے۔ وہ ایسا مہینہ ہے کہ جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزہ رکھنا فرض قرار دیا ہے اور اس مہینے کی راتوں میں تراویح میں پڑھنا نفل کر دیا ہے (یعنی فرض نہیں بلکہ سنت ہے) جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

جو شخص اس مہینہ میں کوئی ایک نیک کام اپنے دل کی خوشی سے بطورِ خود کرے گا تو وہ ایسا ہوگا کہ جیسے رمضان کے سوا اور مہینوں میں فرض ادا کیا ہو۔

اور جو اس مہینے فرض ادا کرے گا تو وہ ایسا ہوگا کہ جیسے رمضان کے سوا دوسرے مہینے میں کسی نے ستر (۷۰) فرض ادا کیے۔

اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔

اور یہ مہینہ سوسائٹی کے غریب اور حاجت مندوں کے ساتھ مالی ہمدردی کا مہینہ ہے۔'' (مشکوٰۃ)

صبر کا مہینہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ روزوں کے ذریعہ مومن کو خدا کی راہ میں جمنے اور اپنی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ روزہ دار ایک مقررہ وقت (صبح صادق) سے لے کر دوسرے مقررہ وقت (غروبِ آفتاب) تک اللہ کے حکم کے مطابق نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ بیوی کے پاس جاتا ہے۔ اس سے اس کے اندر اللہ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس بات کی مشق ہوتی ہے کہ موقع پڑنے پر وہ اپنی بھوک، پیاس، جذبات و خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہے۔

دراصل دنیا میں مومن ہر وقت حالت جنگ میں ہوتا ہے۔ اُسے طاغوتی، شیطانی اور بدی کی قوتوں سے قدم قدم پر لڑنا پڑتا ہے اگر اُس کے اندر صبر کی صفت نہ ہو تو وہ ابتدائی حملہ میں ہی پسپا ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ مہینہ صبر کی بھرپور مشق کرواتا ہے۔

'ہمدردی کا مہینہ' سے مطلب یہ ہے کہ صاحب استطاعت روزہ دار کو چاہیے کہ وہ بستی، محلے کے غربا کے لیے حسب توفیق سحری و افطاری کا انتظام کرے۔

''مواساۃ'' سے مراد مالی اور زبانی ہمدردی کرنا ہے۔

اس حدیث مبارک میں ماہِ رمضان کی رحمتوں اور برکتوں کا بطورِ خاص ذکر کر کے آپؐ نے استقبال رمضان کی ترغیب دے کر جنت کا

حریص بنایا ہے۔

دیگر ممالک کے متعلق تو خیر کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ سعودی عرب میں استقبالِ رمضان کا صحیح منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں تو رمضان کی تیاریاں ماہِ شعبان سے ہی شروع ہو جاتی ہیں مگر رمضان کا چاند نظر آتے ہی ایک عجیب خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہر ایک دوسرے کو ماہِ رمضان کی مبارکباد دے رہا ہوتا ہے۔ سپر مارکیٹوں میں تاجروں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنی اپنی مصنوعات کی خریداری پر زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا گفٹ ''مجانا'' یعنی مفت دیں۔ جبکہ اپنے وطن عزیز میں میں نے اپنی گنہ گار آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا کہ عین ماہ رمضان میں ایک دکاندار اپنے گاہک کو قیمت کم نہ کرنے کا جواز یہ بتا رہا تھا کہ'' یہی تو ایک مہینہ ہے کمائی کرنے کا۔''اللہ کرے کہ ہمارے ملک عزیز کے تجار بھی یہ نکتہ جان لیں کہ برکت میں اور غیر ضروری طور پر زیادہ قیمت وصول کرنے میں بہت فرق ہے۔

مجھے یقین واثق ہے کہ اگر رمضان المبارک با قاعدہ سے پہلے طے شدہ پروگرام کے مطابق گزارا جائے تو یقیناً یہ بہت اچھے اثرات چھوڑے گا۔

سب سے پہلی اور اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہمارے دین میں ظاہری اعمال کی بجائے اہمیت نیت کو دی گئی ہے۔ بخاری میں تو پہلی حدیث ہی اس موضوع پر بیان کی گئی ہے۔**اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ** (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)۔

ایک ہی عمل ہوتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے کیا جائے تو جنت کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے اور وہی عمل اگر اللہ کی رضا کی بجائے نام ونمود کی خاطر کیا جائے تو شرک اصغر قرار پاتا ہے۔ اسی لیے روزہ کے معاملے میں بھی خالص نیت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب کا قول ہے کہ روزہ اور فاقہ میں فرق نیت کرتی ہے۔

نیت کے لیے الفاظ کی ادائیگی ضروری نہیں ہے۔ دل سے روزہ رکھنے کی نیت کر لینا ہی کافی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو خالصتاً یہ نیت کیجیے کہ روزہ محض اور محض اللہ کی رضا کے حصول اور اس کے حکم کی تعمیل میں رکھا جا رہا ہے۔ میرے مالک نے جو فعل عام دنوں میں حلال قرار دیا تھا اُسے ماہِ رمضان میں مخصوص وقت (صبح صادق تا غروب آفتاب) تک کے لیے حرام قرار دے دیا ہے اور بندے نے مالک کی رضا کی خاطر کیوں اور کیسے اگر اور مگر کا اپنا فلسفہ بگھارے بغیر بلا چون وچرا مالک کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نیت خالص ہو گی تو پھر خود بخود آنکھ کا بھی روزہ ہو گا اور کان کا بھی، زبان کا بھی روزہ ہو گا اور جسم کے دیگر اعضاء کا بھی۔ پھر انشاء اللہ روزہ اس حدیث کے مصداق نہ ہو گا جس میں اللہ کے رسولؐ نے فرمایا۔

''بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ جنھیں سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا......''

قرآن پاک میں نماز، زکوٰۃ اور انفاق کے احکامات کی تکرار ملتی ہے مگر رمضان المبارک کے حوالے سے احکامات سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۸۳-۱۸۵ کے علاوہ کہیں نہیں ملتے۔

سن دو ہجری میں یہ حکم آیا۔

یایھا الذین امنو کتب علیکم الصیام

اس پہلے حکم میں بتایا گیا کہ یہ روزے تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے۔ اور ان کی غرض وغایت بھی بیان کر دی گئی کہ اس کا مقصد تقویٰ کی صفت پیدا کرنا ہے۔ اس میں قدرت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھنے کی گنجائش بھی رکھی گئی۔ پھر ایک سال بعد ایک اور حکم آیا جس میں روزہ نہ رکھنے کی چھوٹ مخصوص عذرات کی بنا پر ہی دی گئی۔ (البقرہ ۱۸۵)

گویا اب امت مسلمہ کے ہر بالغ، صحیح العقل اور صحت مند فرد کو روزہ رکھنا ہے تا کہ بحیثیت مجموعی امت میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو جائے۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ روزہ کا مقصد تقویٰ کی صفت کو بڑھانا اور مسلسل بڑھاتے رہنے کی کوشش کرنا ہے۔ چونکہ تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ روزہ رکھتے ہی یہ تبدیلی تو فوراً پیدا ہو جاتی ہے کہ شدید بھوک اور شدید گرمی میں جبکہ حلق میں کانٹے پڑ رہے ہو، سخت پیاس کے باوجود اور مکمل تنہائی میں بھی کوئی روزہ دار فرج میں رکھا ہوا ٹھنڈا اور پسندیدہ مشروب چھوتا تک نہیں۔ اگر چہ بظاہر تو اسے

دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔مگر یہ شعور اور احساس جاگ رہا ہوتا ہے کہ جس کے لیے روزہ رکھا ہے وہ تو ہر جگہ دیکھ رہا ہے۔یہی احساس سال کے باقی ماندہ مہینوں میں زندہ اور اجاگر رکھنے کی ضرورت ہے۔جب نفس کی ایسی تربیت ہو جائے تو پھر یہ روزہ فقط بھوکے اور پیاسے رہنے کا ہی عنوان نہیں رہتا بلکہ ہر ہر عضو اور یہاں تک کہ سوچ تک کا بھی روزہ ہو جاتا ہے۔ایسے ہی روزہ کے متعلق آپؐ نے فرمایا:

الصوم جُنّۃٌ(روزہ ڈھال ہے)

جس طرح ڈھال دشمن کا وار روکنے کے کام آتی ہے اسی طرح مومن جو ہر وقت حالت جنگ میں ہوتا ہے، روزہ اسے اس کے ازلی دشمن شیطان کے وار سے بچاتا ہے اور شیطان اس ڈھال سے سر ٹکرا کر ناکام ہو جاتا ہے۔

روزہ دراصل ایک ریفریشر کورس کے مثل ہے۔ایک ماہ کی اس تربیت گاہ سے گزرنے کے بعد اگر اس تربیت کے اثرات سال کے باقی گیارہ مہینوں میں بھی نظر آئیں تو بلاشبہ ایسا روزہ دار خوش نصیب ہے اور یہ روزوں کی قبولیت کی نشانی سمجھی جاسکتی ہے۔

ذرا آغاز مضمون میں بیان کی گئی حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی حدیث کو ایک مرتبہ پھر ذہن میں دہرایئے۔کیا اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس ماہِ مبارک میں رحمتوں اور نوازشوں کی سیل نہیں لگا رکھی؟ ہم دنیا میں اگر کسی دکان یا سپر مارکیٹ میں جاتے ہیں جہاں ایک چیز خریدنے کے بدلے میں ایک چیز مفت Buy one get free کی خبر پاتے ہیں تو فوراً اپنے ہر جاننے والے کو اس خوشخبری کی اطلاع دیتے ہیں کہ وہ بھی اس اسپیشل آفر سے مستفید ہو سکے۔اللہ تعالیٰ نے تو ۷۰ گنا زیادہ کی ترغیب دی ہے اور پھر بھلا اللہ کا وعدہ بھی جھوٹا ہو سکتا ہے......؟ کیوں نہ ہمیں اس سیل سے خود بھی فائدہ اٹھانا چاہیے اور دوسرے عزیز و اقارب اور احباب کو بھی ترغیب دینی چاہیے۔

اس ماہِ مبارک میں زیادہ سے زیادہ نوافل ادا کرنے اور جوش و خروش کے ساتھ فرائض ادا کرنے پر توجہ دینی چاہیے کہ نوافل کا اجر فرائض کے برابر اور فرائض کا اجر ۷۰ گنا زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے۔

ماہِ رمضان کا چاند دیکھنا:

ماہِ رمضان کا چاند دیکھنا اس برکت والے مہینے کا ابتدائی عمل ہے۔اب تو خیر ٹی وی نے چاند دیکھنے کا شوق ہی گویا ختم کر دیا ہے ورنہ ہمارے بچپن میں تو رمضان اور عید کا چاند دیکھنے کا شوق اور لطف ہی کچھ اور ہوتا تھا۔گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر لوگوں کی متلاشی نظریں ہلالِ رمضان و عید کو تلاش کیا کرتی تھیں اور جسے نظر آجاتا وہ پھر دوسروں کی رہنمائی کرتا اور مبارکباد کا ایک شور و غل عجب سماں پیدا کر دیتا تھا۔

ماہ رمضان کا چاند دیکھنا اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ جب چاند نظر آئے تو اسی رات تراویح پڑھنا ہوگی اور سحری کو اٹھ کر روزہ رکھنا ہوگا۔

سحری کی فضیلت و برکت:

روزہ تمام امتوں پر فرض رہا ہے۔

یا ایھا الذین امنو کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم ......

آج بھی روزہ مختلف مذاہب میں رکھا جاتا ہے۔حتیٰ کہ ہندو بھی روزہ رکھتے ہیں جسے وہ ''برت'' کا نام دیتے ہیں۔اگرچہ مختلف امتوں میں روزہ رکھنے کا انداز مختلف رہا ہے۔مثلاً یہودیوں میں روزہ کے دوران سحری کھانا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔جبکہ امت مسلمہ میں سحری کھانا باعث برکت قرار دیا گیا۔رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سحری کھایا کرو کیونکہ اس میں بڑی برکت ہے۔(ابن ماجہ) اسی طرح مسند احمد کی ایک روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا۔سحری کھانے والوں پر اللہ رحمت فرماتا ہے اور فرشتے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔اللہ کے رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کا معمول تھا کہ صبح صادق سے قبل سحری کھا لیا کرتے تھے۔

روزے کی فرضیت سے انکار کفر ہے اور بلا عذر شرعی روزہ ترک کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد کے مطابق بلا عذر شرعی ترکِ روزہ کی تلافی عمر بھر کے روزے نہیں کر سکتے۔بات بالکل واضح ہے کہ ماہِ رمضان کے علاوہ روزہ تو کسی بھی مہینے اور کسی بھی وقت (ماسوائے مکروہ و ممنوع ایام) رکھا جاسکتا ہے مگر نہ تو وہ نیکیوں کی بہار (کہ جو ماہ رمضان کے سبب

سے ہوتی ہے) اور فضا بنائی جاسکتی ہے اور نہ ہی فرشتوں کی دعائیں اور آمین جو اس ماہِ مبارک کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، وہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اگر کسی عذرِ شرعی کی بنا پر روزہ رکھنا ممکن نہ ہو تو کسی مسکین کو دو وقت کا کھانا اپنے کھانے کے معیار کے مطابق کھلا دینا ضروری ہے۔

افطار میں تقدیم وتاخیر:

افطار کے معنی روزہ کھولنے یا روزہ کھلوانے کے ہیں۔ سورج غروب ہوتے ہی روزہ افطار کرنا مسنون ہے۔ رسولِ اکرمؐ روزہ افطار کرنے میں تاخیر نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ایک متفق علیہ حدیث کے مطابق آپؐ نے افطار میں جلدی کرنے کی ترغیب دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔

''میری امت کے لوگ خیر کی حالت میں رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کیا کریں گے۔''

کسی دوسرے روزہ دار کا روزہ افطار کرانا بڑے اجر کی بات ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی مذکورہ حدیث کی رو سے روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار کے اجر کے برابر اجر ملے گا جبکہ روزہ دار کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اگرچہ افطار معمولی اور سادہ سی چیز سے کیوں نہ کرایا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں روزہ افطار کرانا بھی ایک اسٹیٹس اور نمود ونمائش کا مسئلہ بن گیا ہے۔ بلکہ اب تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ افطار کرانے کے لیے باقاعدہ کارڈز جاری کیے جاتے ہیں۔ بے جا نمود ونمائش بھی افطار پارٹی کا حصہ بنتی جارہی ہے جو افطاری کی روح کے فلسفہ کے عین منافی فعل ہے۔ حقیقت میں بہترین افطاری وہ ہے جس میں غربا اور مساکین کو مدعو کیا جائے۔ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے تو محض ایک کھجور یا لسی کے ایک گھونٹ سے افطار کرا دینے سے بھی روزہ دار کا اجر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کا یہ مقصد قطعاً نہیں کہ روزہ دار کو محض ایک کھجور یا لسی کے ایک گلاس سے ہی روزہ افطار کرایا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق جو کچھ بھی میسر آئے اس سے محض اور محض اللہ کی رضا کے حصول کی نیت سے روزہ افطار کرا دینا چاہیے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ افطار کے وقت نظریں افطاری کے سامان کا جائزہ لینے میں لگی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ وقت نہایت اہم ہوتا ہے اس وقت کی اس اہمیت کا احساس کیا جائے کہ یہ وقت قبولیت دعا کا وقت ہے۔ افطاری سے قبل کے چند لمحات میں امت مسلمہ کی سلامتی، قوت واخوت واتحاد کی دعا کیجیے۔ بدعنوان وبدکردار حکمرانوں کی اصلاح یا پھر ان سے نجات حاصل کرنے کی دعا کیجیے۔ اسی طرح اپنے دوست احباب، عزیز و اقارب کی بھلائی اور اتحاد و اخوت میں بڑھوتری، گناہوں سے مغفرت و رحمت کی دعا کی جائے۔ پھر اذان ہوتے ہی افطار کی غرض سے سامان خورد ونوش پر ٹوٹ پڑنے کی بجائے متانت، وقار، شائستگی اور سنجیدگی کے ساتھ اتنا کھا پی لیا جائے کہ کھانے پینے میں زیادتی قیام اللیل میں بے رغبتی اور سستی کا باعث نہ بنے۔

رسول اللہؐ افطار کے بعد یہ کلمات ادا کیا کرتے تھے۔

ذہب الظما وابتلت العروق وثبت الاجر ان شاء اللہ

پیاس بجھ گئی، رگیں تروتازہ ہوگئیں اور اللہ نے چاہا تو اجر وثواب ضرور ملے گا۔

ایک مسنون دعا یہ بھی ہے:

اللھم انی لک صمت وبک امنت و علیک توکلت وعلی رزقک افطرت

افطاری اور نمازِ مغرب کے بعد کھانا وغیرہ کھا کر اگر اللہ توفیق دے تو تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن کے حصہ کا ترجمہ ایک نظر ضرور دیکھ لیا جائے کہ اس سے تراویح پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور حافظ صاحب کا تراویح میں پڑھے جانے والا ایک ایک لفظ دِل پر دستک دیتا ہے۔

بالعموم ہم ان امور سے واجبی طور پر واقفیت رکھتے ہیں تاہم محض تذکیر کے طور پر ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جن سے روزہ نہ ٹوٹتا ہے اور نہ ہی مکروہ ہوتا ہے۔

☆ بھولے سے کھا پی لینا۔ اگر کوئی روزہ دار بھولے سے کچھ کھا یا پی لے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ بلکہ بعض بزرگوں کے نزدیک ایسے روزہ دار کو کہ جو بھولے سے کچھ کھا یا پی رہا ہو اسے ٹوکنا بھی نہیں چاہیے حتیٰ کہ وہ حاجت پھر کھا یا پی لے۔

☆ سرمہ لگانے سے۔

☆سر پر تیل لگانے یا جسم پر مالش کرانے اور خوشبو سونگھنے سے۔

☆اگر کوئی چیز حلق میں بلا ارادہ اور بلا اختیار چلی جائے۔

☆شدت گرمی سے نہانے، کلی کرنے (کہ جس سے پانی حلق میں داخل نہ ہو) یا سر پر گیلا کپڑا باندھنے یا جسم پر گیلا کپڑا لپیٹنے سے۔

☆بغیر پیسٹ لگائے برش کرنے سے۔

البتہ درج ذیل افعال سے پرہیز لازم ہے کہ اس سے کفارہ اور قضا دونوں لازم آتے ہیں۔

☆کوئی چیز (خواہ دوائی ہی کیوں نہ ہو) قصداً کھا یا پی لینے سے۔

☆حالت صوم میں وظیفہ زوجیت ادا کرنے سے۔

☆کوئی ایسا فعل سرزد ہو گیا کہ جس سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا مگر از خود یہ سمجھ کر کہ روزہ فاسد ہو گیا ہے، ارادتاً روزہ توڑ دینے سے۔

اب مختصراً کچھ ان اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جن سے قضا لازم آتی ہے۔

☆سحری کا وقت گزرنے کے بعد یہ سمجھ کر ابھی سحری کا وقت ہے کچھ کھا پی لینا۔

☆غروب آفتاب سے قبل یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا ہے، روزہ افطار کر لینا۔

☆بغیر نیت کے تمام دن کچھ کھایا نہ پیا (حضرت عمرؓ کا وہ قول ملحوظ رہے کہ فاقہ اور روزہ میں فرق کرنے والی نیت ہے) تاہم اگر نصف النہار سے قبل نیت کر لی تو روزہ ہو جائے گا۔ نیت کرنے کے لیے الفاظ کا ادا کرنا ضروری نہیں۔ دل میں نیت کر لینا ہی کافی ہے۔

☆کان کے اندر دوائی ڈالنے سے۔

☆ارادتاً منہ بھر قے کرنے سے۔

☆بھولے سے کچھ کھا پی لیا اور از خود سمجھ لیا کہ روزہ ٹوٹ گیا ہے اب مزید کھانے پینے میں کوئی مضائقہ نہیں لہٰذا پیٹ بھر کر کھا پی لیا۔

روزہ توڑنے سے حتی الوسع اجتناب کرنا چاہیے۔ روزہ توڑنے کا کفارہ ایک غلام کو آزاد کرانا یا پے در پے ساٹھ روزے رکھنا اور اگر اس کی سکت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو اپنے اوسط معیار کے مطابق کھانا کھلانا ہے۔

اعتکاف کی سعادت

اعتکاف کے لغوی معنی خود کو روکے رکھنا، مضبوطی سے قائم رہنا اور کسی مقصد سے مکمل وابستگی کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد بیسویں روزے کو نماز مغرب کے بعد سے طلوع ہلال عید تک گھر بار اور دنیا داری کے جھمیلوں سے کٹ کر یکسوئی کے ساتھ کسی آباد مسجد کے گوشہ میں قیام کرنا ہے۔ گویا ایک محدود مدت کیلئے دنیاوی مصروفیات کو تج کر کے مکمل طور پر خود کو اللہ کی عبادت، فکر آخرت اور اجر آخرت کی خاطر محنت و مشقت میں مشغول کر لینا ہے۔

اعتکاف بڑے ہی اجر کی عبادت ہے۔ یہ سنتِ موکدہ ہے۔ رسول اکرمؐ نے ہمیشہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ اعتکاف میں گزارا۔ فقط ایک سال آپؐ نے اعتکاف نہیں کیا اور سبب اس کا یہ تھا کہ آپؐ جہاد پر نکلے ہوئے تھے۔ تاہم اگلے ہی برس آپؐ نے 10 کی بجائے بیس دنوں کا اعتکاف فرمایا۔

اعتکاف بہت ہی اعلیٰ وارفع اور پر مشقت عبادت ہے۔ معتکف (وہ شخص جو اعتکاف میں ہو) ماسوائے انتہائی اشد ضرورت اپنے گوشہ اعتکاف سے باہر نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ مناسب یہ ہے کہ اس اعلیٰ وارفع عبادت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے اس کی ماہ رمضان کی آمد سے قبل ہی منصوبہ بندی کر لی جائے۔ مثلاً سب سے پہلے اپنے محلے، مسجد اور اپنے ہم خیال احباب کی فہرست تیار کر لی جائے۔ پھر ان سے رابطہ کر کے ذاتی اور نجی قسم کی ملاقاتوں میں اعتکاف کی اہمیت و فضیلت سمجھا کر انہیں اعتکاف میں اپنا ساتھی بنانے کی ترغیب دی جائے۔ جب چند ساتھی اعتکاف بیٹھنے پر اپنی آمادگی ظاہر کر دیں تو پھر ان کے ساتھ باہمی مشورہ اور سہولت کے مطابق 24 گھنٹوں کا باقاعدہ ایک پروگرام بنائیے۔ یہ پروگرام ایسا ہونا چاہیے کہ زیادہ وقت سونے اور آرام کرنے میں ہی نہ گزرے بلکہ زیادہ سے زیادہ وقت اس ماہ مبارک میں ساعاتِ اعتکاف میں زیادہ سے زیادہ خیر و برکات سمیٹنے میں گزرے۔ لیلۃ القدر

کی نعمت بھی اسی مبارک عشرہ میں ہے۔ لہٰذا اسے تلاش کیجئے۔ جس کا بہترین ذریعہ قیام اللیل اور تلاوت قرآن پاک ہے۔ یہ عشرہ جہنم سے چھٹکارہ کا بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے عفوودرگزر اور دوزخ سے چھٹکارہ کے لئے دعائیں کیجئے۔ امتِ مسلمہ، اپنے ملک، والدین، عزیز واقارب اور دوست احباب کو اپنی دعاؤں میں نہ بھولیں۔ نماز تراویح کے بعد تراویح پڑھے جانے والے پارہ یا قرآن کے حصے کا مفہوم نمازیوں کے سامنے پیش کیجئے۔ اس سلسلے میں کسی بھی تفسیر سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ذاتی طور پر تفہیم القرآن کی سفارش کروں گا کہ اس کی زبان اور انداز عام فہم ہے۔ اس کے بعد گھنٹہ بھر کے لئے احادیث کا اجتماعی مطالعہ کیجئے۔

اس کے بعد باوضو ہوکر سونے کی تیاری کیجئے اور نیند آنے تک خود اپنا احتساب کیجئے کہ آج کے دن وقت کے قیمتی متاع کا ضیاع تو نہیں ہوا۔

سحری کے وقت سے کچھ عرصہ قبل اندازاً (دو گھنٹے) پہلے اٹھئے اور اپنے ساتھیوں کو جگایئے۔ اگر کھانا گھر سے آنے کا اہتمام ہے تو بہت خوب۔ ورنہ بحالتِ مجبوری کوئی ایک ساتھی کھانا لانے کے لئے مسجد سے نکل سکتا ہے تاہم اسے غیر ضروری گفتگو سے اجتناب کرنا ہوگا۔ اس دوران کچھ نوافل ادا کیجئے سحری کھانے کے بعد اپنے گوشہ معتکف سے باہر نکل آیئے اور نماز باجماعت کے لئے پہلی صف میں پہنچ جایئے۔

نمازفجر کے بعد مختصر سا درسِ قرآن یا اجتماعی طور پر مطالعہ قرآن کا اہتمام کیجئے۔ نماز اشراق کا التزام کیجئے۔

اس کے بعد دواڑھائی گھنٹے کے لئے سوکر آرام کیجئے تاکہ رات کو نوافل ادا کرنے میں سہولت رہے۔ بیدار ہونے کے بعد وضو کیجئے اور حسب رغبت پارہ سوا پارہ روزانہ تلاوت کیجئے اگر وقت ہو تو کوئی بھی دینی لٹریچر کا مطالعہ کیجئے۔ نماز ظہر کے بعد قیلولہ ضرور کیجئے۔ آرام کرنے کے بعد بیدار ہوکر وضو کرکے اجتماعی مطالعہ کیجئے۔ آپس میں خوشگوار موڈ میں تبادلہ خیالات کیجئے کہ یہ معلومات میں ذخیرہ کا اضافہ ثابت ہوگا۔ تہذیب کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور تقدس مسجد کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپس میں سوال جواب کیجئے۔ صحابہ کرام کے واقعات سنا کر اپنا ایمان بڑھایئے اور جذبوں کو مہمیز دیجئے۔ یہ سب کچھ اس قدر شائستگی پر وقار انداز کے ساتھ ہو کہ دیگر نمازیوں کی عبادت میں خلل نہ پڑے۔

نمازعصر کے بعد منصوبہ بندی کے تحت مختلف موضوعات پر مذاکرہ کا اہتمام کیا کیجئے۔ سیرت النبیؐ کا مطالعہ کیجئے۔ تحریکی کتب کا مطالعہ کیجئے۔ ایک دوسرے کو سنایئے اور اسے جذب کرنے کی کوشش کیجئے اور یہ کام ایسے انداز اور ایسی دھیمی آواز میں ہونا چاہیے کہ دیگر نمازیوں کی عبادت میں خلل اندازی کا سبب نہ بنے۔

افطار سے قبل کے لمحات قبولیت دعا کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ لہٰذا افطار سے قبل خوب دعائیں کیجئے۔ اپنے لئے بھی اور اپنے ملک وقوم کے لئے بھی۔ امتِ مسلمہ کے لئے بھی اہل خاندان کیلئے بھی۔

ماہ شوال کا چاند ذوق وشوق سے دیکھئے۔ چاند دیکھتے ہی اعتکاف کی مدت ختم۔ چاند دیکھ کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیجئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے کہ اس رب العزت نے اعتکاف میں بیٹھنے کی سعادت نصیب فرمائی۔ اب خوش خوش گھر جایئے اور لایعنی رسومات سے بچیئے۔

عام طور پر لوگ عید کی نماز پڑھنے کیلئے جاتے ہوئے صدقۃ الفطر ادا کرتے ہیں صدقۃ الفطر کے لئے نماز عید کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ دورانِ ماہ رمضان ہی ادا کردیا جائے تو زیادہ بہتر ہے تاکہ مساکین صحیح طور پر عید کی خوشیاں مناسکیں، بروقت کپڑے لباس اور خوراک کا انتظام کرسکیں۔ اسلام میں عبادات کے حوالے سے مرد وزن میں کوئی تخصیص نہیں۔ سب کے لئے میدان کھلا ہے اور یکساں مواقع ہیں۔ الحمدللہ تجربہ اور مشاہدہ یہی کہتا ہے کہ اسلام پسند مسلم خواتین عبادات کے لحاظ سے مردوں سے کم نہیں۔ خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کے معاملے میں تو راقم الحروف نے جدہ میں ایسے ایسے مناظر بھی دیکھے ہیں کہ خواتین ایک اپیل پر اپنے ہاتھوں کے گہنے تک اتار کر دے دیتی تھیں (اللہ انہیں بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین)

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ...... (التحریم:٦)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے......)

اس آیت کی روشنی میں لفظ اہل کی تفصیل وتفسیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے تاہم کم از کم اہل وعیال تو اس کے دائرہ میں بدرجہ اولیٰ آتے ہیں۔لہٰذا اہل خانہ کو بھی ماہ رمضان کی رحمتوں اور برکتوں سے فیض یاب ہونے کی ترغیب دی جائے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں سہولیات بہم پہنچائی جائیں۔

اعمال کے میدان میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مرد و زن سب کے لئے کھلا میدان چھوڑا ہے۔خواتین پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔لہٰذا خاتون خانہ کو چاہیے کہ ماہ شعبان سے ہی اس ماہ مبارک کی منصوبہ بندی کرے۔

سحر وافطار میں کھانے پکانے کے سلسلے میں سادگی اپنائیں۔نت نئ ڈشز بنانے کے تجربات کرنے کی بجائے وقت کو بچائیں اور اس وقت کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنائیں۔

مناسب ہوگا کہ اپنے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر عشرہ میں خوردونوش کا ایک چارٹ بنالیں تاکہ کسی دن بھی یہ نہ سوچنا پڑے کہ آج افطاری میں کیا بنانا اور پکانا ہے اور سحری میں کیا کھایا جائے گا۔پھر اس کی روشنی میں کھانا پکانے میں استعمال ہونے والی بیشتر اشیاء جن پر خاصا وقت صرف ہوتا ہے مثلاً لہسن، ادرک، پیاز اور چٹنی وغیرہ ماہ شعبان میں ہی چھیل چھلا، پیس پسا کر مناسب شیشوں/ ڈبوں (Containers) میں بھر کر فرج میں رکھ لیں۔گھر کے بچے بچیاں اس کام کو ''پراجیکٹ'' سمجھ کر ہنسی خوشی ہاتھ بٹائیں گے۔اسی طرح مناسب مقدار میں مختلف سبزیاں ابال کر، شامی کباب اور سموسے مناسب مقدار میں بنا کر فریزر میں رکھ لیں تاکہ رمضان میں بوقتِ ضرورت صرف فرائی کرنے پڑیں۔گھر کے کام کاج کے لئے اگر کوئی ملازم وغیرہ ہیں تو خاتون خانہ بالخصوص ایسا طریقہ اپنائیں کہ ان پر کام کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ملازمین سے کم مشقت لینا بھی باعثِ اجر وثواب ہے۔کوشش کی جائے کہ کسی نہ کسی انداز میں ملازمین کے علاوہ غرباء ومساکین بھی شریک افطار وسحر ہوں۔

چھوٹے بچوں میں روزے کا شعور پیدا کرنے کے لئے سات برس سے زائد عمر کے بچوں کو کہا جا سکتا ہے کہ بچوں کے ایک دن میں دو یا تین روزے ہوتے ہیں۔اور پھر انہیں دو یا تین مناسب وقفوں میں کھانا کھلا کر، شربت پلا کر انہیں افطاری کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔بارہ سال کی عمر سے زائد بچوں کو باقاعدہ روزہ رکھوایا جائے۔ان کی افطاری پر بطور خاص خوشی کا اظہار کیا جائے اور چھوٹے چھوٹے انعامات دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔اگرچہ خواتین اجتماعی طور پر بھی اعتکاف کر سکتی ہیں تاہم افضل یہی ہے کہ خاتون اپنے گھر میں ہی اعتکاف کرے۔ازواج مطہرات المومنینؓ اپنے حجرات میں ہی اعتکاف کرتی تھیں اس مقصد کے لئے گھر کا کوئی ایسا گوشہ کہ جہاں شوروغل نہ ہو اور یکسوئی سے عبادت کی جا سکتی ہو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھئے کہ ماہ رمضان کی اہمیت و فضیلت محض روزوں کی وجہ سے نہیں ہے۔روزے تو پہلی امتوں پر بھی کسی نہ کسی انداز میں فرض کئے جاتے رہے ہیں بلکہ اس کی فضیلت تو اس وجہ سے ہے کہ اس ماہ مبارک میں قرآن پاک لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل فرمایا گیا۔

شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن هدى للناس...... (البقرہ:۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کیلئے سراسر ہدایت ہے۔

چنانچہ اس مبارک مہینے میں قرآن پاک سے زیادہ سے زیادہ تعلق جوڑا جائے۔اسے پڑھا جائے، پڑھایا جائے، سنا اور سنایا جائے۔صاحبِ قرآن ہر سال حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ دورہ قرآن کیا کرتے تھے۔ہر لمحہ اور ہر لحظہ کسی نہ کسی طور پر ہمارا تعلق قرآن سے رہنا چاہیے۔اس کا خصوصیت سے اہتمام کیجئے۔اب تو تقریباً ہر زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ موجود ہے۔اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا مفہوم بھی اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کیجئے۔اگر اس ماہ مبارک میں ہمارا اوڑھنا بچھونا قرآن ہو جائے تو انشاءاللہ ہم محسوس کریں گے کہ اس سال کا ماہ رمضان ہمارے سابقہ روزوں سے بہت بہتر گزرا ہے۔اللہ ہمیں توفیق دے کہ ایسا ہی ہو۔آمین۔ ☆☆☆

غزل

بولتا کون ہے چار سو کون ہے
آپ جیسا یہاں ہو بہو کون ہے

کس کی آواز پر چونک اٹھتا ہے دل
جس سے کرتا ہوں میں گفتگو کون ہے

گوشۂ دل میں ہے کون سِمٹا ہوا
اور پھیلا ہوا چار سُو کون ہے

خواب ہے یہ کوئی یا کہ ہے واہمہ
یہ مرے روبرو خوبرو کون ہے

کس کی آواز ہے پانیوں سے پرے
وہ لبِ جُو مرا لقمہ جُو کون ہے

وہ نہیں ہے تو پھر شاخِ احساس پر
طائر خوش نما خوش گلو کون ہے

غم اٹھاتے ہوئے درد سہتے ہوئے
میرے دل میں بڑا جنگجو کون ہے

میں کرامتؔ ہوں تیرا سفیرِ سخن
پھر تو کیوں پوچھتا ہے کہ تو کون ہے

کرامت بخاری

نظم

آمنہ رمیصا زاہدی

روشنی ملے جیسے
غیر کا اُدھارا ہو
آرزو کی مشعل میں
خونِ دل ہمارا ہو

خوش تو ہے بہت لیکن
اکثر ایسا لگتا ہے
جیسے اس کا ہنسنا بھی
غم کا استعارہ ہو

ایسا راہبر کیسے
راستہ دکھائے گا
خود نہ دیکھ سکتا ہو
خواہشوں کا مارا ہو

ہم بھی ضد نہیں کرتے
ساتھ بھی چلے چلتے
احمقوں کی جنت کو
کوئی تو سدھارا ہو

گھونٹ کر گلا دل کا
بیٹھ جائیں گے چپکے
عاشقوں کی وحشت کو
حُسن کا اشارہ ہو

یاس کی سیاہی جب
دل کو گھیرنے آئے
میری کم نگاہی کو
خواب کا سہارا ہو

غزل

حبیب الرحمٰن

تمام ماہ و نجم کیوں نہ ہم زباں بنتے
فلک نے دیکھے ہیں ابروترے کماں بنتے

چرا نہ ہم سے نگاہیں کہ ہم نے دیکھا ہے
ہر ایک بات پہ سو سو کہانیاں بنتے

اک عمر چاہیے تزئینِ گلستاں کو مگر
بس ایک پل اسے لگتا ہے بے نشاں بنتے

زمین چیختی اور آسماں سسکتا جو لب
دلوں میں اٹھی ہوئی ٹیس کی زباں بنتے

اے جذبِ شوق ٹھہر دیر کب لگی ہے یہاں
کلی کی خندہ لبی کو عذابِ جاں بنتے

چھپا لیا گیا چہرہ کہ ہم نہ دیکھ سکیں
لب و نظر کا مسکنا پہیلیاں بنتے

جو تو نے زلف سنواری تو یہ خیال آیا
اے کاش ہم ترے ہاتھوں کی انگلیاں بنتے

گئے اس اور، مگر کشتیاں جلا نہ سکے
سو کیسے جہدِ محبت میں کامراں بنتے

پیے تھے اشک کہ آنکھیں گوارہ کر نہ سکیں
کسی کا پھول سا چہرہ دھواں بنتے

حبیبؔ میکش و زاہد سبھی کے دیکھے ہیں
بتوں کی چاہ میں ملبوس دھجیاں بنتے

مہکتا آنگن

رفّو حویلی کے بڑے دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔ سامنے وسیع صحن تھا۔ کوئی غیر معمولی بات محسوس ہو رہی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے دوبارہ تاحدِ نگاہ دیکھا۔ حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا۔ غم پہ غم...... وہ وہیں دل تھام کر بیٹھ گئی۔

کیا سب کچھ ختم ہو گیا...... کیا اس طرح بھی ہو سکتا ہے؟ کیا وقت یادوں کے نشانات یوں کھرچ دیا کرتا ہے؟ کیا جانے والوں کے بعد، ڈیرے جمانے والے ہر نقش پا کو مٹا دینے میں بہتری سمجھتے ہیں۔ لیکن...... لیکن کیا ان مصنوعی طریقوں سے یادوں کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ انمٹ نقوش یوں لمحوں میں وقت کی نذر ہو سکتے ہیں؟

اس حویلی کے در و دیوار، ہر بیل بوٹے اور سر اٹھائے کھڑے درختوں کے ساتھ ہی تو ساری یادیں وابستہ ہیں۔ ہر چیز نفی میں جواب دے رہی ہے، نہیں نہیں ایسا نہیں ہے...... تم غلط سمجھ رہی ہو۔ وقت اور افراد کی گواہیاں موجود ہیں۔ ہوا اور فضا نے اس کے ہی سرگوشی کی اور......

یا شاید آنکھیں موند لیں۔

پھر جیسے یکدم پورا گھر خوشبو سے مہک اٹھا۔ اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔

ماسی عظمت اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی ڈیوڑھی کے ساتھ بنی بڑی ساری کیاری میں لگے نیاز بو کے پودے کو ہلاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔

''کاکی! نور بی بی گھر میں ہے؟'' انہوں نے نیاز بو کے پھول کو ناک سے لگا ایک لمبی سانس کھینچ کر خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے رفو سے سوال کیا۔

ہاں ماسی ہاں! بی بی ادھر ہی ہیں۔'' اور بی بی اماں ماسی کی آواز سن، سارے کام چھوڑ باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔''

آؤ عظمت آؤ بیٹھو'' انہوں نے چارپائی بچھاتے ہوئے کہا۔

میں شیرے ترکھان کے پاس پیڑھی ٹھکوانے آئی تھی سوچا خیریت کا پتہ کرتی جاؤں۔''

ماسی، اماں بی بی کے پاس آنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی نکالتی تھیں پھر وہ پہروں بیٹھی ایک دوسرے کا دکھ بانٹتی رہتیں اور پانچ سالہ رفو ان کی ساری باتوں میں سے رشتوں کی محبت اور سچے خلوص کی شیرینی دل کے نہاں خانہ میں اتارتی رہتی۔ اس کو کتنا اچھا لگتا تھا بڑوں کا آپس میں ملنا اور باتیں کرنا۔

ماسی عظمت آتیں چاچا عبدالغنی یا ماما فقیر۔ یہ سب جب موتیا، مہندی، دن کا راجہ اور نیاز بو کے پودے کے پاس سے گزرتے، اک ذرا سا ہاتھ لگانے سے پورا گھر مہک اٹھتا کوئی چھوٹی سی ڈوری، بور یا پھول توڑ کر ساتھ لے آتا تو ماحول معطر ہو جاتا۔ رفو تو جیسے منتظر ہی ہوتی اس کو تو ان کی باتوں سے بھی گلوں کی خوشبو آنے لگتی۔ وہ چھوٹی عمر میں ہی پودوں کی خوشبو سے کہیں بڑھ کر رشتوں کی خوشبو پا کر کھل اٹھتی۔ عجب سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اس پر۔

ماسی زینو جب بھی آتیں وہ اماں بی بی اور ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی رہتی رات ڈھل جاتی مگر وہ سوتی جاگتی کیفیت میں ان کے پوپلے منہ سے پھول جھڑتے دیکھتی رہتی بی بی بستر پر جانے کا نام لیتیں تو وہ ماسی زینو کے ساتھ اور بھی چپک جاتی ان کی گود میں سر رکھے نیم خوابیدہ نگاہوں سے تکتی رہتی۔ میں ماسی کے ساتھ سوؤں گی وہ فیصلہ سنا دیتی ماسی زینو اسے بانہوں میں بھر لیتیں اور وہ محبت کے نشہ میں چور خوابوں کی دنیا

میں پہنچ جاتی صبح کی بیداری میں وہ مالا مال ہوتی۔ رواں رواں سرشار ہوتا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ بزرگوں کا لمس پورے سراپہ میں عجب برقی رو دوڑا دیتا اور رفو کا اگلا پورا دن، قرآن پڑھانے والی بوا جی کا گھر ہو یا سکول اپنی سکھیوں کو ماسی کے گیت سنانے گزر جاتا اس سرشاری میں سبق بھی کتنی جلدی یاد ہو جاتا وہ خود بھی حیران رہ جاتی۔ ایک مہمان چلا جاتا تو دوسرے کا انتظار شروع ہو جاتا اداسی میں یوں لگتا جیسے دل خالی ہو گیا ہو۔

خاندان میں شادی بیاہ کا موقع آتا تو مہینوں پہلے تیاریاں شروع ہو جاتیں بزرگ اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے اور بچوں کی تو عید ہو جاتی وہ گھر کے صحن میں لگے بڑے بڑے درختوں پر پرندوں کی طرح چہچہاتے کپڑے لتوں کی باتیں کرتے۔ مقابلہ بازی ہوتی۔ رفو کو ان ساری باتوں سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوتی کہ بہت ساری ماسیاں اور مامے، چاچے جمع ہوں گے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔ ''ماسی علو کتنے دن پہلے آئیں گی؟ رحمت ماسی بعد میں کتنے دن رہیں گی؟ وہ اماں بی بی کی جان کھاتی دن گنتی رہتی۔

اسے یہ سب بہت عزیز تھا شادی بیاہ میں جہاں بچے مختلف طرح کی دلچسپیوں میں مصروف رہتے وہ یہ دیکھ دیکھ خوش ہوتی رہتی کہ سب بڑے مل کر بیٹھے ہیں اگلی پچھلی باتیں ہو رہی ہیں روٹھنے والے بھی منا لئے جاتے اور بچوں کے آپس میں رشتے ناطے بھی طے ہو جاتے تمام خاندانی مسائل صلاح مشورہ سے حل کر لئے جاتے۔ شادی کے تمام کاموں کو سب آگے بڑھ بڑھ کر نمٹانے کی کوشش کرتے، گھر والے کی عزت کو اپنی عزت سمجھا جاتا لڑکی کی شادی میں تو ان باتوں کا زیادہ ہی خیال رکھا جاتا۔ رفو خیالوں میں گم مسکرائے جا رہی تھی بات ہی کچھ ایسی تھی پھپھو کی بیٹی شازیہ کی شادی میں برات والے دن نجانے کیوں پھوپھو کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ خواتین کی طرف جو کھانا آیا ہے وہ کم ہے ہوتے ہوتے یہ بات بڑے بھائی تک پہنچ گئی وہ منتظم تھے انہوں نے گھر کی تمام چھوٹی بڑی ذمہ دار خواتین کو بلا کر تاکید کر دی کہ تم میں سے کوئی کھانا نہیں کھائے گی جب تک مہمان خواتین نہ کھا لیں اور دیکھو بہت حکمت سے تقسیم ہونی چاہیے اور ثریا (پھوپھو) کو مہمان خواتین کے ساتھ بٹھا دو انہیں کہہ دو فکر کی کوئی بات نہیں ہے آرام سے کھانا کھائیں اور پھوپھو تو مہمان کے ساتھ مزے سے کھانا کھاتی رہیں اور مرد و خواتین کی پوری ٹیم فکرمندی سے کھانا کھلاتی رہی بعد میں کھانا بچ بھی گیا۔ بعد میں اس واقعہ کو یاد کر کے سب بہت محظوظ ہوتے کہ پھوپھو دوسروں کو پریشان کر کے خود کیسے بے فکر ہو گئی تھیں۔

برات کی خاص طور پر بہت فکر ہوتی تھی ابا کہا کرتے تھے کہ براتی تو ایسے مہمان خصوصی ہوتے ہیں جو زندگی میں ایک دفعہ ہی لڑکی والوں کے گھر آتے ہیں۔ رہے لڑکے اور لڑکی والے ان کا تو سدا کا ساتھ ہوتا ہے اس لئے ان کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ کھانا اچھا ہو، کم نہ ہو، پہلے کھلائیں، بیٹی عزت سے رخصت ہو ہر چھوٹی چھوٹی بات کا خیال رکھا جاتا۔

رفو بچپن سے ہی یہ ساری باتیں اخذ کرتی رہتی۔ خوشی غمی کے ایسے تمام مواقع اس پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے۔

بڑی حویلی کے آنگن میں کھڑی رفو چاروں طرف اداسی سے تک رہی ہے سب کچھ اسی طرح ہے ڈیوڑھی کے ساتھ والی دیوار میں پھولوں کی کیاری کا نقشہ بھی پرانا ہے۔ مہندی، موتیا دن کا راجہ اور نیاز بو کے پودے بھی موجود ہیں...... وہ ان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ہلا رہی ہے حویلی جو کبھی ان کے اک ذرا سے ہلانے پر مہک اٹھتی تھی آج خوشبو سے عاری ہے کیا ان کی مہک اڑ گئی ہے یہ سب اپنی خوشبو کھو چکے ہیں؟

یہ حویلی، یہ پھول کلیاں، یہ گھنے درخت سب کو کس کی نظر کھا گئی؟

عید شبرات، گرمیوں کی چھٹیاں، تمام مواقع یادگار بن جاتے، انسانوں کی الگ الگ ٹولیاں بن جاتیں چند ماہ کے بچہ سے لے کر سو سال کے بزرگ تک موجود ہوتے لڑکے بالے چھوٹی بندوقیں لے کر زمینوں کی طرف نکل جاتے اور لڑکیاں بالیاں حویلی کے صحن میں بچھی کھاٹوں پر بیٹھ خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتیں سکول کالج کے شہروں کے قصے سنائے جاتے۔ زمینوں پر بیلنے چلتے، گڑ شکر بنتا دیکھا جاتا ٹیوب ویل چلائے جاتے اور ساری ساری دوپہر لڑکے گرمی دور کرنے کا

سامان کرتے ایسے میں لڑکیاں بڑی بزرگ خواتین کے ساتھ الگ وقت مقرر کر کے زمینوں پر جاتیں، گاجر، مولی اور ساگ توڑتیں، کھیتوں کی سیر کرتیں اور ٹیوب ویل پر پانی سے کھیلتیں، اٹھکھیلیاں کرتیں۔ کتنا سہانا وقت تھا۔ بڑی اماں اپنی بہو بیٹیوں اور کام کاج کرنے والی ماسیوں کے ساتھ کھانے پکانے سے ہی فارغ نہ ہوتیں۔

گاؤں میں آ کر سب کو اپنے ارمان پورے کرنے کا خوب موقع ملتا ہر کوئی اپنی پسند کی الگ الگ ڈشیں بنواتا اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ یہاں آ کر سب کو بھوک بھی بہت لگتی تھی۔ نجانے کیوں سارا دن منہ چلتا رہتا گفتگو اور لذت کام و دہن، دونوں کام زوروں پر رہتے۔ پھلوں کے ٹوکرے اور بوریاں آتیں اور منٹوں میں ختم ہو جاتیں۔ بڑے ابا محبت پاش نظروں سے ایک ایک کو تکتے رہتے۔ ہر طرف قہقہے ہوتے، مختلف کھیل کھیلے جاتے، دوڑ کے مقابلے، پٹھو گرم، آنکھ مچولی، پکڑن پکڑائی، کوکلا چھپا کی گڈے گڈیوں کی شادیاں اور نجانے کیا کیا...... رفو سوچتے سوچتے خود ہی مسکرا دی۔

مگر ہاں! خاندان کے اتنے بڑے اکٹھ میں بھی تہذیب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔ بڑے ابا کا پلنگ ایسی مرکزی جگہ پر ہوتا جہاں سے پورے گھر پر ان کی کڑی نگاہ رہتی، ان کے مزاج اور نگاہ کی شناسائی ماؤں کو اپنے اپنے بچوں کے حوالے سے الرٹ رکھتی۔

قلفی والے کی پوری پوری ریڑھی خرید لی جاتی۔ اسے اس کی لاگت سے زیادہ اجرت دے کر رخصت کر دیا جاتا۔ وہ ناقابل یقین خوشی اور حیرت سے اپنی راہ لیتا اور چھوٹے بڑے سب قلفیوں کا مزہ اڑانے میں مصروف ہو جاتے۔

بی بی صبح ہی صبح چولہے میں آگ جلا دیتیں۔ ابا کا حقہ تازہ کیا جاتا، ناشتے کا وقت شروع ہوتے ہی ڈیوڑھی میں آنے والوں کا تانتا بندھ جاتا، چاچا صدرو سکندر مصلی، رحمان تانگے والا، بھائی ماکھا، کمبلا اور ماما فقیر، نجانے کون کون، گڑ والی چائے اور رات کی بچی ہوئی روٹیوں کی کشش میں کھنچا چلا آتا، رشتوں کی مٹھاس سب کو شہد کی مکھیوں کی طرح چھتے کی طرف کھینچ لیتی، صحن میں جھاڑو دینے والی ماسی دانو بھی ہم مذہب نہ ہونے کے باوجود جب بی بی اور بچوں کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرتی تو جہاں ماسی دانو کے چہرے پر گہرا سکون ہوتا وہیں رفو ان ساری محبتوں اور چاہتوں کو دل کے نہاں خانے میں اتارتی بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھ رہی تھی۔

آج تو یادیں عود کر آئی تھیں۔ رفو جیسے ماضی کی لہروں میں بہہ چلی تھی۔ کیسے کیسے انمول واقعات ذہن کے پردہ پر نمودار ہو رہے تھے۔

ابا کی آٹھ بیٹیاں اور پانچ بیٹے تھے۔ ابا کو اپنی ساری اولاد سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے خود کو ہی اس کا محور و مرکز بنایا تھا، بچوں کو کسی اور طرف دیکھنے ہی نہ دیا تھا۔ ایسا سرشار رکھا کہ کسی کو تشنگی محسوس ہوئی اور نہ ہی ضرورت۔ رفو کے ایک ماموں تو ان کے قریب ہی رہتے تھے بی بی کو ان سے اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت تھی اور یہی محبت رفو، گڈو اور باقی بچوں میں غیر محسوس طریقے سے منتقل ہو رہی تھی۔ ماموں کو بھیجے بغیر بی بی کے نوالہ نہ اترتا تھا۔ بچوں کے ذریعے ہر چیز ماموں کے گھر بھجوانا ان کا معمول تھا۔ جس محبت، احتیاط اور اہتمام سے وہ رفو کے ہاتھ میں برتن پکڑاتیں اس سے کہیں زیادہ شدت سے رفو کے دل و دماغ میں یہ عمل اپنے نقوش ثبت کر دیتا اور محبت کے نشہ میں چور رفو برق رفتاری سے بی بی کی اطاعت میں جُت جاتی بی بی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور دل کے جذبات و احساسات رفو کے دل کے تاروں کو چھیڑتے اور خوبصورت جلترنگ بج اٹھتے دیکھو رفو! رستہ میں کہیں کھڑی نہ ہونا کسی سے کوئی بات نہ کرنا سیدھی ماموں کے گھر جانا اور فوراً واپس پلٹ آنا'' وہ بی بی کی باتوں کو پلو سے باندھ، سیدھی وہاں جا کر دم لیتی اور الٹے قدموں واپس آ جاتی، آتے جاتے اسے ایسے محسوس ہوتا بی بی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں نافرمانی کی تو ان کو پتہ چل جائے گا۔

کبھی روپے پیسے کی ضرورت پڑتی تو بی بی اسے ماسی عظمت کی طرف بھیجتیں وہ جا کر انہیں پیغام سناتی تو جواب ملتا ''کا کی! تو بیٹھ میں ابھی آئی۔'' تھوڑی دیر بعد مطلوبہ رقم اس کی مٹھی میں دبا کر تاکید کرتیں ''دوڑ جاؤ اور یہ اپنی ماں کو دے دینا۔'' ماسی کا یہ عمل بھی رفو پر فکر و عمل کے دروازے کھول دیتا۔ ''پیسے تو ماسی کے پاس بھی نہ تھے لیکن انہوں نے

کیسے پریشانی دور کر دی ہے۔'' رفو واپسی پر سارا رستہ یہ گتھی سلجھاتی رہتی کہ بی بی اور ماسی کا اتنا گہرا رشتہ ہے، ایک دوسرے پر اتنا مان ہے۔

جیسے ہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھلتا بی بی کے دل کے در بھی وا ہو جاتے، لبوں سے دعائیں جاری ہو جاتیں ''یا اللہ جو کوئی بھی ہمارے گھر میں داخل ہوا ہے اگر یہ ضرورت مند ہے تو اس گھر سے ناکام نہ لوٹے۔'' اللہ ان کی لاج رکھ لیتا صحن و دل کے در مزید کشادہ ہو جاتے اور آنگن کی خوشبو میں اضافہ ہو جاتا رفو کے دل کے اندر پڑنے والا بیج جڑ پکڑ لیتا۔

آج حویلی کی تنہائی اور ویرانی کو دیکھ کر رفو کو بظاہر ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہے لیکن ہر چیز نفی میں جواب دے رہی ہے اس کی نگاہوں کے سامنے منظر تبدیل ہو رہا ہے، اس گھر کے آنگن میں پاؤں پاؤں چلنے والے قلقاریاں مارنے، لڑکپن اور جوانی کی بہاریں دیکھنے والے آج اپنے اپنے گھروں میں انہیں روایات کے امین بنے بیٹھے ہیں جس کا سبق انہوں نے اسی اونچی دیواروں، بڑے دروازوں اور کھلے صحن کی حامل حویلی کے مکینوں سے پڑھا تھا ابا کی ساری اولاد کے آنگن بھی اسی طرح مہک رہے ہیں جیسے یہ حویلی اپنے وقت میں معطر تھی۔ محبتوں کا جو رس یہاں سے سب نے کشید کیا تھا اسی کو وہ آگے منتقل کر رہے ہیں سب نے اپنے بڑوں کے طریقہ کو اپنایا ہے سب ہی اس حویلی میں گزارے وقت کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں خونی رشتوں کی محبت کے ساتھ انہوں نے یہاں سے انسانیت کے لئے سچی وفا کا درس بھی لیا ہے آنگن کی یہ مہک فانی نہیں ابدی ہے۔ ابا، بی بی نے اپنی نسلوں کو خون جگر سے سینچا ہے، اپنی روایات کا امین بنایا ہے، سب کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا ادراک ہے۔

حویلی کے بڑے دروازہ کی چرچراہٹ سے رفّو نے چونک کر دیکھا کہ دروازہ کھل چکا ہے، آس پاس سے خواتین اس سے ملنے چلی آ رہی ہیں۔ وہ اس کے ساتھ آنگن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھی ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی ہیں۔

''یہ در تو آج بھی کھلا ہے چاروں طرف خوشبو پھیلی ہوئی ہے ابا، بی بی نے رشتوں کی جو شیرینی دلوں میں اتاری، اپنے عمل سے ایثار و قربانی اور یگانگت کا جو حسین سبق پڑھایا، اپنا زندہ نمونہ سامنے رکھا وہ کمزور نہیں ہے، کچا نہیں ہے۔'' رفّو خواتین کی باتوں کا جواب دے رہی ہے، انہیں بتا رہی ہے وہ اعتراف و اظہار کر رہی ہے۔

''ابا، بی بی! آپ نے جس پنیری کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا وہ اب ایک گلستان بن چکا ہے۔ آپ کی ساری اولاد نے اپنے اپنے مکانوں کا دروازہ بڑا رکھا ہے، سب نے اپنے گھروں میں موتیا، گلاب، مہندی، رات کی رانی اور نیاز بو کے پودے لگائے ہیں جن کی سدا بہار خوشبو سے سب کے آنگن مہکتے ہیں۔ ہر آنے جانے والا اس خوشبو کو سانس کے رستہ روح کے اندر اتارتا اور سرشار رہتا ہے۔ سچی اقدار و روایات کا پڑھایا ہوا آپ کا سبق کچا نہیں ہے، ہمیں ازبر ہو گیا ہے۔ اب ہم اپنا خون جگر اپنے آنگن میں تمام پودوں کو دیتے ہیں۔ یہ تمام محبت اور خوشبو سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی ہے اور جہاں آپ سب مقیم ہیں وہاں تک بھی پہنچ رہی ہے کیونکہ یہ فانی نہیں ابدی ہے آپ نے ہمیں جن روایات کا امین بنایا ہے ہمیں ان کا پاس و لحاظ ہے ہم نے آپ کے جوڑے ہوئے تمام روابط کو مضبوطی سے برقرار رکھا ہے ان کی حفاظت ہم آخری سانس تک کرتے رہیں گے۔''

رفّو آج بھی ایک عجب سرشاری کی کیفیت میں حویلی کے مہکتے آنگن میں بیٹھی پرانے جذبوں کو تازہ کر رہی ہے یہ گھر آج بھی آباد ہے یہاں آ کر وہ روحانی قوت حاصل کرتی ہے، اپنے آپ سے مخاطب ہوتی ہے۔

یہاں ہم خالی ہاتھ آتے ہیں اور دامن بھر کر لے جاتے ہیں ہم رشتوں کی تمام خوشبوؤں کو جذبات و احساسات کی زنبیل میں بھر کر معاشرہ میں پھیلے تعصب اور عداوت کے تعفن کو دور کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے گھروں کے آنگن ہی نہیں گلی محلے بھی مہک اٹھتے ہیں۔''

اس نے لمبی سانس لے کر خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے سوچا ''میر کے لئے کل کی طرح آج بھی یہ سب باعث طراوت ہے۔''

☆......☆......☆

جنت

وہ اماوس کی رات تھی یا ماہ کامل کی، ساکن تھی یا ارتعاش زدہ، وہ تاریکی کے ان سب اوصاف سے بے نیاز کالی سیاہ چادر میں شہر کے پوش علاقہ کی ویران سڑک پر تنِ تنہا قدم اٹھاتی کسی سنسنی خیز منظر کا حصہ لگ رہی تھی۔ دیکھنے والی آنکھ اول تو دور دور تک کوئی نظر نہ آ رہی تھی اور اکا دکا کوئی سواری گزری بھی تو ایسے جیسے یہ اپنوں نے دیکھا ہی نہ ہو۔ خوفزدہ شہر کے لوگ غیر معمولی مناظر، واقعات اور حادثات پر بھی آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں، یہ بھی ایسا ہی شہر تھا۔ یہاں حادثات سے زیادہ سانحات کی کثرت تھی۔ یہ اس عورت کی قسمت ہی تھی کہ بنا کوئی گزند پہنچے وہ محوِ سفر رہی۔

اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ وہ وقفے وقفے سے رک جاتی کبھی دائیں، بائیں، پیچھے اور آگے دیکھ کر وہ آسمان پر بھی نظر ڈالتی۔

بالآخر سفر کا اختتام ہو ہی گیا اور وہ ایک جگہ رک گئی۔

سڑیٹ لائٹ کی ہلدی نما روشنی کا خوب بڑا ٹکڑا اس بنگلے کے گیٹ کو اپنے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ وہ اب بے جان سی لگ رہی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا یہ وہ قدم تھے جو پورے سفر میں زمین کے ساتھ مضبوطی سے جمے تھے۔ لڑکھڑاہٹ سے بچنے کے لئے اس نے گیٹ کے ساتھ لگے کیبن نما کمرے کی گرل کا سہارا لینا چاہا تو بے اختیار سسکاری سی اس کے ہونٹوں سے ابھری۔ ساتھ ہی کہیں سے جھینگر بولنا شروع ہو گیا۔ ''شاہ ہاؤس'' کے نام کی تختی کے ساتھ اطلاعی گھنٹیوں کے بٹن کی قطار گیٹ کے ساتھ جڑی تھی۔ لیکن اس کی انگلیوں کی پوریں یہاں تک پہنچ کر سن ہو چکی تھیں۔

''کون ہو؟''

جس گرل کا سہارا اس نے لیا تھا وہاں پر ایک چہرہ ابھرا اور اسے خاصی کرختگی سے پوچھا تو اس نے اپنے گرد چادر کو چہرے پر ڈھلکاتے کپکپاتے جواب دیا۔

''عبدالرحمٰن گیٹ کھولو میں ہوں۔'' آواز پہچان کر چوکیدار کی آنکھیں حیرت اور تجسس سے پھیل گئیں۔

''اس وقت!'' وہ بڑبڑایا اور نظر آتی سڑک پر نظریں دوڑانے لگا۔ دور دور تک کوئی آثار نہ تھے جس سے وہ ذہن میں ابھرے سوالات کے جواب کا سراپا تا۔

چند لمحوں بعد گیٹ کھل چکا تھا اور وہ اندر داخل ہو چکی تھی۔ مگر اب جیسے سوچ میں تھی کہ مزید قدم کہاں بڑھائے۔ چوکیدار نے نیند سے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ کچھ الجھن اور کچھ پریشانی کے عالم میں اس کو دیکھا، وہ بھی جیسے گومگو کے عالم میں سامنے کچھ فاصلے پر موجود بلند نقشین محرابی دروازے کو دیکھ رہی تھی جو بند تھا۔ نہ کوئی جھری اور نہ کوئی روزن اسے دروازے سے اندر دنیا کے احوال کا پتہ دے رہا تھا۔

''یہ اتنا ہی سختی سے بند لگ رہا ہے جیسے تمہاری قسمت صنوبر شاہ!''

اس کے اندر سے آواز ابھری اور آنسوؤں کے دو چار قطرے چہرے سے پھسلتے نہ جانے کہاں گرے۔ دروازے کے دائیں بائیں لگے لائٹ شیڈ چمکتے فرش پر متوازی دھاریاں سی بنا رہے تھے وہ ان دھاریوں پر پیر جماتی قدم دروازے کی جانب بڑھانے لگی تو رک گئی۔ چوکیدار نے شاید اس سے کچھ کہا تھا۔

''امی جی گھر بند ہے۔''

''کیا گھر بند ہے؟''

اس نے اس کا جملہ دہرا کر سوال کیا، یقین نہ تھا جو سنا ہے وہ یہی ہے۔

''امی جی آپ رات ۳ بجے آ گئی ہو۔ سب لوگ ۱۱ بجے صبح پہنچیں گے۔''

چمکدار دھاریاں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں اور ایسے ہی اس کے دماغ میں موجود نیورونز کو ملنے والے پیغامات میں پہچان اور حسیات کی تقسیم بکھرنے لگی۔

''کہاں......؟'' ایک لفظ کہتے ہی اسے اپنی وقعت کا خوب اندازہ ہونے لگا تو وہ چپ ہوگئی۔ حالانکہ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ سب کہاں ہیں۔ ایک جھرجھری سی پورے بدن میں اس کے پھیل گئی اور وہ ٹھنڈے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ اب کے عبدالرحمٰن نے اس کو ترحم سے دیکھا۔

''امی جی میرے کمرے میں آجاؤ آپ۔'' وہ بدستور فاصلے سے ہی بولا تو اس کی بات سن کر تھکان جیسے اس کے روئیں روئیں میں پھیلتی گئی۔

''صنوبر شاہ کیا واقعی تم زندہ ہو؟ کیا تم زوال کی اس سطح پر آگئی ہو کہ شاہ ہاؤس کے چوکیدار کی کوٹھڑی کی چھت تمہارا آسرا رہ گئی ہے؟''

درد کی ٹیسیں ہر طرف تھیں۔ اس کا سر اسکے بازوؤں پر گرتا چلا گیا چوکیدار نے اس کی کیفیت دیکھ کر اسے بازو سے تھاما تو وہ بنا مزاحمت کے کھڑی ہوگئی۔ مزاحمت کی طاقت اور کیفیت کی تفریق غم کے ساتھ مل کر باقی ہی نہ رہ گئی تھی۔ اس کے ڈولتے قدموں کو عبدالرحمٰن سہارا دیتا اپنے بستر تک لے آیا۔

''وہ یہاں تک آئیں کیسے؟ ابھی تک اس کو یہ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ آج صبح ہی تو وہ اسے اولڈ ہاؤس سے صاحب کی بہن کے گھر چھوڑ کر آیا تھا اور اگلی صبح پھر اسے واپس اولڈ ہاؤس لے جانا تھا۔ ایسا ہی کہا تھا نازنین بی بی نے لیکن یہ رات تین بجے یہاں کیسے آگئیں۔ چوکیدار کے دماغ میں خیالات چکرا رہے تھے۔ نازنین بی بی کا نمبر بھی مستقل بند جا رہا تھا۔ اُسنے چوتھی بار موبائل کی سکرین پر نظریں گاڑیں جہاں لائن منقطع ہوچکی تھی۔ چوکیدار اور وہ دونوں ہی پریشان کن کیفیت میں تھے، مگر دونوں کی پریشانی کی اپنی جدا دنیا تھی، وہ مالک سے وفاداری نبھانے کی سعی میں تھا جبکہ وہ مالک کی عطا کردہ نعمتوں سے محروم ہوجانے پر مالک سے فریاد کناں تھی۔ دونوں کے مالک کی نوعیت بھی مختلف تھی۔

اپنی کوشش میں ناکامی پر عبدالرحمٰن نے جھنجھلا کر زیرلب مالک کو دوچار نامناسب الفاظ کہے اور جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر صنوبر شاہ پر سرسری نظر ڈالی جو نہ جانے کہاں گم تھی۔

''باغات گھومنے گیا ہے دعاؤں کا باغ چھوڑ کر۔'' عبدالرحمٰن نے بڑبڑاتے ہوئے صنوبر شاہ پر ترس بھری نگاہ جمائی جو اس چھوٹے سے کمرے میں نظر آتے لان میں جمے خوب لمبے درختوں کی قطاروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی ماہ و سال بدلنے کے مناظر پر اشک بار تھی۔ سب ہوا کے مانند متحرک، راج ہنس سی گردن اٹھائے، شان بے نیازی کے تاثرات کے ساتھ صنوبر شاہ سامنے موجود لان میں کبھی ملکہ کی آن بان کے ساتھ موجود ہوتی تھی اور آج قصر شاہ کے چوکیدار کے کمرے کی کھڑکی سے ماضی کی تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رات کے اس پہر نعمتوں سے لدے پھندے ماضی کی دھول چبھ رہی تھی۔ سگریٹ کا شعلہ سانیم اندھیرے میں چمکتا تو صنوبر شاہ ساکت ہی دکھائی دیتی۔

وقت سرک رہا تھا۔ فجر کی اذانوں کی دھیمی دھیمی آوازیں آنا شروع ہوچکی تھیں اسی وقت عبدالرحمٰن کے موبائل پر کال آنا شروع ہوگئی۔ ''نازنین باجی'' وہ استہزائیہ انداز میں بڑبڑایا اور فون کان سے لگا کر بات کرنے لگا۔ اب کے اس کے انداز میں تابعداری کے رنگ تھے۔ گاہے بہ گاہے وہ صنوبر شاہ پر نظر ڈالتا جو ساکن سی لگتی تھی۔ ''جی طلال صاحب تو فیملی کے ساتھ صبح پہنچ جائیں گے، امی کو میں ان کے آنے سے پہلے ہی چھوڑ آؤں گا جیسے ہی نقی آتا ہے۔'' آخری بات کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

''خواہ مخواہ کا ڈرامہ کرتے ہیں یہ سیٹھ لوگ۔ ماں کو ساتھ رکھ نہیں سکتے اور فکر ایسی ظاہر کرتے ہیں جیسے مر جائیں گے۔'' اس نے اخ تھو کر کے جذبات کی بھڑاس نکال دی۔

صبح نقی ڈرائیور کے آنے سے بہت پہلے ہی نازنین آگئی تھی، صنوبر شاہ کی اکلوتی بیٹی۔ ماتھے پر ڈھیروں شکنیں سمیٹے اس نے عبدالرحمٰن سے محض اتنا کہا ''کہاں ہیں؟'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے کمرے کی جانب اشارہ کردیا۔ لب بھینچتے ہوئے وہ اس طرف بڑھ گئی۔ ساری رات پریشانی میں گزری تھی صنوبر شاہ نہ جانے کس وقت اور کس طرح اس کے گھر سے نکل گئی تھیں۔

کچھ گھنٹوں بعد جب وہ اولڈ ہاؤس سے لوٹ رہی تھی تو طلال کی گاڑی اولڈ ہاؤس کے پرشکوہ گیٹ سے اندر آرہی تھی۔ ہپی مدرز ڈے کی کتنی ہی رنگ برنگی چیزیں گاڑی میں موجود تھیں۔ نازنین نے مسکرا کر بھائی کو دیکھا اور ہاتھ ہلا دیا۔ رکنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ پہلے ہی ماں کو شاہ ہاؤس سے اپنے گھر واپس لا کر مدرز ڈے کا حق ''بھرپور'' ادا کرنے کا فرض ادا کیا تھا اب اسے اپنے بوتیک جانا تھا جہاں مدرز ڈے اسپیشل ڈسکاؤنٹ پر سیل زور و شور سے محض اسی دن کے لئے جاری تھی۔ ہر سیل بیگ پر لکھا تھا ''ماں میری جنت، ماں میری چاہت'' ☆☆☆

افشاں نوید

منیزہ

جفت عدد کی طرح پے در پے تقسیم کے عمل نے ہلکان کر دیا تھا اسے...... اس کے لباس سے زیادہ شکنیں اس کی روح میں سمائی ہوئی تھیں۔ یہ چار برس کیسے کرب میں گزارے ہیں اس نے...... منیزہ کے امریکہ سے آنے کے بعد میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔

سسرال والوں کے بے حد اصرار پر امریکہ گئی تھیں۔ یہ فیصلہ بھی تو کچھ آسان نہ تھا چار بچوں کی فیملی پر مشتمل اس گھرانے کے لئے۔ مگر شوہر کے بھائیوں کا اصرار کہ ایک پر آسائش زندگی ان کی منتظر ہے کیلیفورنیا میں۔ گھر کا سارا سامان ایک ایک چیز بیچ کر گئیں وہ۔ جب روانگی والی دوپہر میں ان سے ملنے گئی تو بہت آبدیدہ تھیں وہ خالی گھر کو تالے لگاتے ہوئے کہ کتنی محنت سے انہوں نے اس فیصلے سے قبل۔

میری پڑوسن جو میری اچھی دوست بھی ہیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور دکھ شیئر کرنا ان کی عادت ہے۔ ان کے جانے کے بعد میرے بچوں کے پاس فیس بک پر ان کے بچوں کے پیغامات آتے رہتے ہیں کہ وہ کس طرح انجوائے کر رہے ہیں امریکی زندگی کو یہ تو کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ خاندان ایک روز یوں صبح صادق کو دوبارہ لوٹ آئے گا اپنے وطن!

سب ہی کو تجسس تھا۔ میں بھی نہ جا پائی کہ ابھی وہ اپنے گھر کو سیٹ کر لیں کچھ سکھ کا سانس لے لیں تو جا کر پوچھوں گی کہ واپس کیوں آ گئیں۔ میرے جانے سے قبل کل وہ خود ہی سہ پہر میں آ گئیں۔ ان کا دھواں دھواں چہرہ ان کے ذہنی انتشار کو منعکس کر رہا تھا۔ بولیں:

''میرے جیٹھ کہتے تھے تیسری دنیا سے نکلو آ کر جدید قوم کی ترقی کے نئے انداز دیکھو یہاں آ کر پتہ چلے گا ترقی کسے کہتے ہیں۔ مگر بھابھی سچ بتاؤں مجھے تو وہاں ڈھونڈنے سے بھی ترقی نظر نہ آئی۔ وہاں تو میں نے 14 سو برس پرانی ''جہالت'' کے ہوش ربا مناظر دیکھے۔ میں نے ہر قدم پر صنف نازک کی قیمت لگتی دیکھی۔ عورتوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک دیکھے ترقی کے نام پر...... وہ تو قدیم دور جاہلیت میں زندہ ہیں۔ جدید تو ہم ہیں اپنے جدید مذہب کی تعلیمات کے ساتھ۔ اس محسنؐ نسواں کی تعلیمات کی قدر تو مجھے اس معاشرے میں جا کر پتہ چلی۔ ہم جو محفوظ ہیں، مامون ہیں، باعصمت ہیں، ہر روپ، ماں، بہن اور بیٹی میں قابل احترام ہیں تو ہمارے مذہب کا احسان ہے ہم پر آپ سوچیں جس سماج میں بیٹی کے اٹھارہ برس کے ہونے کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہو کہ ماں باپ اس کا مزید بوجھ اٹھانے پر تیار نہیں ہوتے۔ وہ بچی کہاں جائے گی کس کے ہاتھ لگے گی، اس کے والدین اس فکر سے بے گانہ ہیں کیونکہ خود ان کے ساتھ سماج یہی سلوک کر چکا ہے۔ لہٰذا اب وہ سماج سے انتقام لیں گے اس کے بوجھ میں اضافہ کر کے۔''

اس کی اس گفتگو کے دوران میرا ذہن اسی سوال پر اٹکا رہا کہ وہ تو معاشی بوجھ سے ہلکان کبھی ایک پر آسائش زندگی کی تلاش میں وہاں گئی تھی یہاں سے اپنی گھر گرہستی سب ختم کر کے گئی تھی تو اتنی جلدی کیوں آ گئی۔

میرے چہرے پر نقش میرا سوال شاید وہ پڑھ چکی تھی۔ اس نے بنا میرے سوال کئے خود ہی جواب کا آغاز کر دیا اور بولی۔

''میرے چار بچے جو میرا اثاثہ، کل کائنات تھے، ان کے بہتر مستقبل کیلئے تو میں نے یہ جتن کئے تھے کہ وہاں ان کو اعلیٰ تعلیم دلواؤں گی اچھی طرح پرورش پا کر یہ ایک کامیاب انسان بن جائیں گے۔ آہ! کتنے سہانے تھے دور کے ڈھول۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ معاشرہ میرے بچوں کو باغی بنا دے گا، مجھ سے میرے بچے چھن جائیں گے۔ یہ تو مجھے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھانا تو در کنار میں تو بچوں کو ڈانٹ تک نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر کوئی بچہ کلاس میں اپنے کسی دوست کو یہ بتا دے کہ اس کے والدین نے اسے ڈانٹا ہے تو پولیس آ جاتی ہے گھر پر۔ میری بیٹی ماریہ جو تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے باپ کے لاڈ پیار نے اس کو بہت ضدی

اورخودسر بنادیا تھا۔ یہاں بھی میری ڈانٹ ڈپٹ اور سختی ہی اسے سیدھا رکھتی تھی۔ وہاں کے سماج نے اس کی یہ برین واشنگ کی کہ تمہاری ماں تمہاری دشمن ہے۔ کیونکہ میں روک ٹوک کرتی تھی۔ وہ مغربی لباس پہننا چاہتی تھی ہر وقت میوزک کی دالدادہ ہوگئی تھی اپنی دوستوں کے درمیان رہ کر میں اسے کبھی پیار اور کبھی سختی سے سمجھاتی تھی کہ ہمیں ان حدود میں رہنا چاہیے جو ہمارے دین نے بتائی ہیں۔ میرے بیٹے بھی اپنے کلاس فیلوز سے اس سختی کا ذکر کرتے ہوں گے جو میں کبھی نمازوں کی بروقت ادائیگی، کبھی لغویات سے روکنے کیلئے کرتی تھی۔ اب تو پولیس بار بار ہمارے گھر آنے لگی تھی۔ اس روز میری بیٹی اس وقت جبکہ میں جاب پر آئی ہوئی تھی ٹی شرٹ اور جینز پہن کر بغیر دوپٹے گھر سے نکلی اور گھنٹوں اپنی دوستوں کے ساتھ اسکیٹنگ کرتی رہی۔ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو میں نے اسے سخت سست کہا۔ وہ روتی رہی۔ صبح کلاس میں ٹیچر نے پوچھا کہ تم کل روتی رہی ہو۔ اس نے پورا واقعہ سنادیا۔ بس اس کے اسکول سے آتے ہی پولیس آئی اور اسے اٹھا کر لے گئی۔ آپ سوچیں میرے خاندان کی عزت کس طرح متاثر ہوئی۔ اس وقت کس طرح تنہا محسوس کیا تھا میں نے اس بھرے معاشرے میں خود کو ایک تھکا دینے والے عمل کے بعد اس کی واپسی ممکن ہوئی۔''

کچھ توقف کے بعد وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''ایک ہی تو بات میرے چاروں بچے بار بار کہتے ہیں کہ ماما اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھیں آپ Negative Minded ہوگئی ہیں۔ میرا تو جو مائنڈ ہے ہمیشہ سے ہی ہے۔ مگر یہ بات میرے معصوم بچوں کو اس معاشرے نے سمجھائی کہ ان کی ماں منفی خیالات کی حامل ہے۔ اب میرے بچوں کے نزدیک ماں کی کیا عزت و آبرو اور وقار رہ گیا۔ جب بچے میری ہر بات کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہوں کہ آپ منفی سوچ رہی ہیں۔ باپ کہتے ہیں بچے اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ اس لئے کہ وہاں ریاست والدین سے یہ حق ہی چھین لیتی ہے کہ وہ اس کے اچھے برے کا فیصلہ کریں۔ میرے اٹھارہ برس کے بیٹے کی گرل فرینڈ روز اسکول جانے کے لیئے اسے لینے آتی ہے۔ میں نے بہت سمجھایا مگر وہ کہتا ہے کہ اس کے ہر دوست کی گرل فرینڈ ہے یہاں اس کی ضرورت ہے۔ اب میں دھیمے دھیمے اس کو اسلامی حدود سمجھاتی رہتی ہوں۔ میں تو اپنے گھر میں بھی ریاست کی قیدی تھی کہ اپنے بچوں کو ڈانٹنے کا حق تک نہیں تھا میرے پاس۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھتے تو فوراً میرا بیٹا با آواز بلند میوزک لگا دیتا۔ میں کہتی سفر میں بے برکتی ہوگی۔ پہلے سفر کی دعا پڑھ لو۔ بچے جھنجھلا جاتے کہ امی آپ اپنی پرانی عادتوں کو بدل دیں۔ وہ اقرا مدارس میں پڑھے ہوئے ٹوپی پہنے والے بچے، اوائل عمری سے میری اسکارف سے سر ڈھانپنے والی بچی۔ میں نے کب سوچا تھا کہ اس معاشرے میں یوں ڈھل جائیں گے۔ وہاں تو بڑے بڑے اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ پاکستانی عورتیں جن لباسوں میں اسٹورز پر خدمات انجام دے رہی ہوتی ہیں سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ وہاں مادی دنیا کی دوڑ نے کسی اقدار اور روایت کو باقی نہیں چھوڑا۔ بس ہر فرد کا وزن اتنا ہی ہے سماج میں جتنا وہ کماتا ہے۔ سب وہاں پیسہ کمانے کی مشینیں ہیں۔ حلال، حرام وہاں جا کر کسے یاد رہتا ہے بھلا ہم بھی اچھا کھانے، اچھا پہننے لگے۔ مگر میرا ذہن بچوں کو دیکھ دیکھ کر کچوکے لگاتا رہتا کہ کیا بس یہی زندگی کی معراج ہے......؟ لیکن وہاں موجود لوگ کم و بیش سب ایک ہی جیسا سوچتے ہیں میں نے تو اپنے سرکل میں کم ہی کسی کو دیکھا جسے اپنے ایمان کو بچانے کی فکر ہو۔ میری جن پاکستانی فیملیز سے ملاقات ہوتی تو اکثر عورتیں میرا باحجاب ہونا سخت ناپسند کرتیں وہ کہتیں کہ تم ہمارے شوہروں کے ذہنوں پر غلط اثرات ڈال رہی ہو وہ بھی ہم سے اسی حیا کا تقاضا کریں گے جبکہ یہاں ملازمت حاصل کرنے کے لئے ہمارا اسلامی حلیہ سخت مزاحمت کا باعث بنتا ہے۔ یہاں بیشتر گھرانوں کی خواتین اسٹورز پر ملازمت کرتی ہیں اور اس ملازمت کے حصول کیلئے انہیں امریکی خواتین جیسا حلیہ مجبوراً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میں سخت دباؤ میں آ گئی اور حجاب ختم کر کے صرف سر کو سلیقے سے ڈھانپنے لگی اس پر بھی سوالیہ نظریں میرا تعاقب کرتیں۔

آہستہ آہستہ ہم اپنا بہت کچھ کھوتے جارہے تھے اور مجھے دکھ یہ تھا کہ میرے شوہر بھی اپنا احساس زیاں تک کھو چکے تھے۔ تب ایک دن دل مضبوط کر کے میں نے بھی یہ فیصلہ گھر میں سنا دیا کہ ہم پاکستان واپس جائیں گے۔ میرے اہل خانہ کے تو منہ کھلے کے کھلے رہ گئے میرے اٹھارہ برس کے بیٹے نے کہا کہ میری ٹیچر ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ اپنی ماں کو

سائیکیٹرسٹ کو دکھاؤ۔ واقعی بابا! ماما اپنے حواس میں نہیں ہیں۔ پاکستان میں کیا تھا ہمارے پاس ایک rigid society جس میں لوگ ایک دوسرے پر انگلیاں ہی اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہاں آ کر تو ہمیں آزادی کی قدر پتہ چلی ہے۔ میرا اصرار بڑھتا گیا کہ میں امریکہ میں مزید نہیں رہ سکی تو میرے بڑے دونوں بیٹوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ ہم ہرگز پاکستان نہیں جائیں گے۔ میں نے اپنے شوہر کو قائل کیا کہ بیٹی کی خاطر ہمیں دوبارہ جانا ہوگا۔ کیونکہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھمکی دینے لگی ہے کہ میں گھر چھوڑ کر ہاسٹل چلی جاؤں گی۔ لہٰذا بحالت مجبوری میں دو بچوں کو وہاں چھوڑ کر بیٹی اور چھوٹے بیٹے کو لے کر انتہائی عجلت میں وہاں سے نکل کھڑی ہوئی۔ بھابھی میں یہاں ہوں مگر میرا دل تو وہیں اپنے دونوں بیٹوں میں اٹکا رہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی کیمرہ ہو کہ لمحہ لمحہ ان پر نظر رکھ سکوں۔ اب وہ میرے بار بار رابطہ کرنے پر بھی کترانے لگے ہیں۔ کہتے ہیں آپ ڈسٹرب کرتی ہیں جب فارغ ہوں گے ہم خود بات کر لیا کریں گے۔ آہ! کتنی کچی عمریں تھیں جنہیں اس سماج نے ڈس لیا۔''

کئی دن ہو گئے تھے اس ملاقات کو۔ دل پر مسلسل ایک بوجھ سا تھا اس کے حالات سے آگہی کے بعد۔ کل صبح وہ اچانک آ گئی اور بولی۔

''بھابھی میں اگلے ہفتے واپس امریکہ جا رہی ہوں آپ دعا کریں۔''

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ بولی۔

''دو بچے اور شوہر یہیں رہیں گے، میں دونوں بیٹوں کے پاس جا رہی ہوں یہاں امی اور بہن کو تاکید کی ہے کہ میرے بچوں کا خیال رکھیں۔ بھابھی رمضان آنے والا ہے۔ میں نہ گئی تو میرے بیٹے روزوں سے بھی محروم رہ جائیں گے۔ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میرا خاندان رمضان کی برکتوں سے محروم رہے۔ اس لئے میں جا رہی ہوں......اسد اور عمیر کو سحری اور افطاری میں ان کی ماما کی ضرورت ہوگی نا......!

☆......☆......☆

غزالہ ارشد

من وسلویٰ

اگر مجھ پر من وسلویٰ نازل ہو رہا ہوتو میں بنی اسرائیل کی طرح کبھی بھی ککڑی، دال اور لہسن نہ مانگوں۔

اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ہنڈیا میں چمچ ہلایا۔

یہ سب مشقت اپنی خریدی ہوئی تو ہے! صرف لذت ذہن کیلئے پہلے لہسن، ککڑی، دال سب کاشت کرو۔ گھر گھر پہنچانے تک خوب محنت کرو اور پھر گھر والیاں بھونتے بھونتے پسینو پسین ہو جائیں۔ پل بھر کا ذائقہ اور پھر دوبارہ وہی پیٹ کا ایندھن۔

اس نے پھر دوپٹے کے پلو سے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کیا اور پنکھے کی طرف حسرت سے دیکھا، جو نجانے کب سے لوڈشیڈنگ کا بہانہ کئے خاموش کھڑا اس کو ٹک ٹک دیکھ رہا تھا، بلکہ اسے تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی سوچوں کا بھی مذاق اڑا رہا ہے۔ کاش بنی اسرائیل اللہ کی نعمتوں کا اقرار کر لیتے اور ہم پر من وسلویٰ نازل ہوتا رہتا۔ پھر ہم عورتوں کی زندگی کتنی خوشگوار ہوتی!

نجانے کیوں آج صبح سے اس کا دماغ بنی اسرائیل کی تاریخ پر گھوم رہا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کا جنون تھا۔ بچوں کو اسکول بھیج کر اور شوہر کے جانے کے بعد وہ زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرتی۔

اسکول بس کے ہارن نے اس کے تصورات کو بکھیر دیا۔ اوہ ہو! بچے آ بھی گئے اور ابھی تک اس نے کھانا بھی تیار نہ کیا تھا آج زیادہ ہی وقت اس نے بنی اسرائیل کی تاریخ پڑھنے میں گزار دیا تھا۔ اب بچوں کو فوری طور پر کیا کھلایا جائے۔ اس نے پل بھر کو سوچا اور نوڈلز زندہ باد کہہ کر جلدی سے پانی ابلنے کے لئے چولھے پر چڑھا دیا خود تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اپارٹمنٹ سے نیچے گئی تاکہ بچوں کے بھاری بھرکم اسکول بیگ پکڑ کر انہیں آسانی دے سکے۔

مما...... بچوں نے بس سے اترتے ہی نعرہ لگایا ان کے پھول جیسے چہرے کھل اٹھے گویا دن بھر کی مشقت تمام ہوئی اور اب ماں کی ٹھنڈی چھاؤں میں لطف ہی لطف تھا۔ مائرہ نے بچوں کو سینے سے لگایا تو اولاد جیسی نعمت پر شکر کے احساسات سے اس کا دل بھر آیا۔ عام حالات میں تو چوتھی منزل سے نیچے اترنا مائرہ کو عذاب لگتا تھا لیکن اس وقت اسے کوئی تھکاوٹ محسوس نہ ہوتی۔ بچے اپنی اسکول کی مصروفیات بتانے لگتے اور مائرہ ہنستے ہنستے بچوں کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ تک آ پہنچی۔

کھانا......ارسلان نے اسکول بیگ ایک طرف پھینکا اور جوتے اتارتے ہوئے نعرہ لگایا۔

پہلے کپڑے بدلو...... مائرہ نے بھی اسی پرزور انداز میں جواب دیا۔ نہیں پہلے کھانا......فائزہ نے بھی مطالبہ کر دیا۔

نوڈلز ابلتے ہوئے پانی میں ڈال کر مائرہ تھوڑا وقت حاصل کرنا چاہتی تھی دیکھیں کون کتنی جلدی کپڑے بدل کر میز تک واپس آتا ہے اور ٹائم شروع ہوتا ہے اب۔ ایک۔ دو۔ تین۔

دونوں بچے بھاگے اور ایک دوسرے سے جیتنے کی کوشش میں جلد ہی واپس آ گئے مگر اس دوران مائرہ نوڈلز تیار کر چکی تھی۔

میں جیت گیا......ارسلان نے پہلے میز پر پہنچتے ہوئے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔ فائزہ کا موڈ خراب ہوا تو مما نے اسے جلدی سے گود میں بٹھا لیا اور فائزہ کو یہ خوشی ارسلان کی جیت سے زیادہ لگی۔

نوڈلز گراتے کھاتے، کھیلتے ہنستے تینوں اس وقت دنیا کے خوش قسمت ترین انسان لگ رہے تھے۔ خوشی تینوں کے چہروں سے پھوٹے پڑتی تھی۔ حالانکہ ارسلان کا اسکول میں آج بہت برا دن گزرا تھا مگر پھر بھی وہ سب بھول کر ماں کے ساتھ خوش تھا۔

کھانا کھا کر بچے تو سو گئے اور مائرہ اپنے تیسرے فیز میں داخل ہو گئی آج ایسا کیا سرپرائز دوں کہ فیضان خوش ہو جائے۔ عجیب بات تھی

کہ شادی کے بعد سے آج تک ایک دن بھی اسے فیضان کے لئے کام کرتے ہوئے کوفت محسوس نہ ہوئی۔ اس کی ہمسائی کبھی حیرت سے پوچھتی کیا تمہاری ''لو میرج'' تھی وہ مسکرا کر جواب دیتی نہیں ''لو'' تو میرج کے بعد شروع ہوا۔

مائرہ کی کوشش ہوتی کہ فیضان کو ہر روز گھر داخل ہونے سے پہلے کوئی مزیدار سا سرپرائز دے۔ کبھی گھر کی سیٹنگ میں کوئی تبدیلی کر دیتی۔ کبھی اپنے بناؤ سنگھار میں تبدیلی لے آتی۔ فیضان اپنی بیوی کی اس فطرت سے واقف تھا اس لئے آتے ہی بجھارت بوجھنے لگ جاتا۔ آج فیضان اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچا تو گھر کے باہر ہی اپنے نام کی تختی دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ''میرا گھر میری جنت'' بڑی خوبصورت خطاطی میں لکھ کر لگایا گیا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی مائرہ کی نظریں فیضان سے دوچار ہوئیں تو فیضان بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''واہ بھئی...... بڑی قناعت پسند ہیں آپ۔ ایسی جنت پر راضی ہو گئیں تو اللہ کہے گا اسے اوپر اعلیٰ جنت دے کر کیا کرنا ہے۔''

''بھئی جہاں میرے بچے ہوں اور میرا شوہر ہو وہی میرے لئے جنت ہے۔''

مائرہ نے ادا سے کہا اور فیضان کے ہاتھوں سے بریف کیس پکڑ لیا۔ جیسے اسے مزید فیضان کی تکلیف گوارا نہیں۔

فیضان کو بھی گھر میں داخل ہوتے اور مائرہ کا کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر دن بھر کی تمام مشقت بھول جاتی۔ جلدی جلدی مائرہ میز پر کھانا بھی لگا دیتی اور دن بھر کے مطالعے سے بھی اسے آگاہ کرتی رہتی کہ اس نے آج کیا پڑھا، کیا سیکھا اور کیا سوچا۔

مائرہ کے پڑھائی کے بڑھتے ہوئے جنون کو دیکھ کر ارسلان نے اسے پرائیویٹ میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ اس نے گھر پر ہی تیاری شروع کر دی۔ انگلش لٹریچر سے اسے ویسے ہی دلچسپی تھی دوسری مشکل یوں آسان ہو گئی کہ اس کا کزن ایک کالج میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔ وہ مشکل میں مائرہ کی مدد کرنے لگا۔ فیضان کے بھرپور تعاون سے مائرہ نے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔

رزلٹ کی خبر سن کر فیضان نے آفس سے چھٹی لی۔ مائرہ کیلئے ایک گولڈ کی چین خریدی اور پھولوں کا گلدستہ لے کر فوراً گھر پہنچا۔

مائرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح فیضان کی شکر گزار ہو۔ اس تمام کامیابی کا سہرا فیضان کے سر تھا۔

''اب اور کیا خواہش ہے میم صاحب......'' فیضان نے سونے کی چین مائرہ کے گلے میں پہناتے ہوئے کہا۔

''بھئی ہم تو تمہارے ہاتھ میں آئے ہوئے وہ بوتل کے جن ہیں جس کا کام ہی اپنی میم صاحب کی خواہشات کو پورا کرنا ہے۔'' فیضان نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''بس جن صاحب ابھی ایک کام باقی ہے۔ آپ ذرا بوتل سے باہر آئیں اور ہمارے لئے ایک اچھی سی نوکری تلاش کریں۔'' مائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر کیلئے فیضان کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔

''کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟'' فیضان نے بے یقینی سے کہا۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے...... وہ خرم بھائی کی بیوی کو نہیں دیکھا کتنی اچھی لگتی ہے بچوں کے ساتھ ہی اسکول چلی جاتی ہے اور ساتھ ہی واپس آ جاتی ہے۔ مزے کے مزے اور پیسے کے پیسے......'' مائرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہاں یہ تو ہے!'' اک لمحے کو فیضان نے سوچا۔ کم از کم بچوں کی فیس کے بوجھ سے ہی نجات مل جائے گی۔

انگریزی تو اس پوری قوم کی کمزوری ہے۔ جھٹ پٹ مائرہ کو بچوں کے اسکول میں ہی نوکری مل گئی۔ صبح خوب افراتفری کا سماں ہوتا۔ بچوں کی تیاری ناشتے، لنچ، سب ساتھ پیک کرتے وہ اپنی تیاری بھی جاری رکھتی اسکول وین کے ہارن پر چند ہدایات فیضان کو دیتی اور دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتی اسکول چل دیتی۔

سب کے جانے کے بعد دروازے بند کر کے فیضان ایک نظر گھر پر ڈالتا۔

یا خدا! یہ میرا ہی گھر ہے؟ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی طوفان نوح یہاں سے گزر کر گیا ہے۔ ہر طرف بکھری چیزیں۔ بچوں کے کپڑے۔ کھانے کا

سامان، فیضان خاموشی سے اپنی تیاری میں مصروف ہو جاتا لیکن ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہی اس کی طبیعت مکدر ہو جاتی۔ سوکھا ہوا ٹھنڈا سلائس، تھرماس کی کالی چائے اور کہاں وہ مائرہ کا گرم گرم پراٹھوں کا ناشتہ کرانا۔ ساتھ ہی ساتھ مسکراتے ہوئے مزے مزے کے چٹکلے چھوڑتے جانا۔ اتنا بے مزہ ناشتہ دیکھ کر فیضان نے فیصلہ کیا کہ بغیر ناشتے کے ہی چلا جایا کرے گا اور کوئٹہ ہوٹل سے چائے کے ساتھ پراٹھا کھالیا کرے گا۔

اسکول سے واپسی پر مائرہ بچوں کے ساتھ تھکی ماندی گھر لوٹتی۔ رات کا سالن گرم کرتی اور پرانی روٹیاں گرم کر کے بچوں کو کھانے پر آمادہ کرتی۔ کھانے کے دوران اس کا باتیں کرنے کا کوئی موڈ نہ ہوتا بلکہ بچوں کو ڈانٹ رہی ہوتی کہ جلدی کھانا کھاؤ اور سونے جاؤ۔

''مما آپ ہم سے بات کیوں نہیں کرتیں...... پہلے تو ہم بہت باتیں کیا کرتے تھے......'' فائزہ نے چونک کر ارسلان کی طرف دیکھا۔

اوہ! ہاں بیٹا اب دراصل میں بھی کام کر کے بہت تھک جاتی ہوں اس لئے باتیں کرنے کو دل نہیں چاہتا۔'' مائرہ نے تھکاوٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

''مما آپ اسکول نہ جایا کریں......'' فائزہ نے ماں سے ہمدردی کی۔

''نہیں بیٹا...... ایسی نوکری روز روز تو نہیں ملتی۔ پھر آپ بچوں کے ساتھ جاتی ہوں اور آپ کے ساتھ واپس آجاتی ہوں۔ آپ لوگوں کو اکیلے بھی نہیں رہنا پڑتا۔'' مائرہ نے ذرا ماحول کو خوشگوار کرنا چاہا لیکن اب آپ ہنستی بھی نہیں ہیں اور ہمارے ساتھ کھیلتی بھی نہیں۔'' ارسلان نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے اس اتوار کو ہم سب خوب کھیلیں گے۔'' مائرہ نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اتوار کو تو ہمیں دوستوں کے ساتھ کھیلنا ہوتا ہے مما کے ساتھ تو روز روز کھیلنا ہوتا ہے۔'' ارسلان نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''اچھا کھانا ختم کرو اور جلدی سو جاؤ۔ مجھے تو بہت نیند آرہی ہے۔''

اف کتنی گہری نیند سو گئی تھی۔ مائرہ نے گھڑی کی طرف دیکھا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ فیضان کے آنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ ابھی گھر بھی ویسے ہی بکھرا ہوا تھا اور کھانا بھی نہ پکایا تھا۔ جلدی سے مائرہ کچن میں گئی۔ گھبراہٹ میں یہ بھی سمجھ نہ آرہا تھا کہ کون سا کام پہلے کرے۔ افراتفری میں سالن چولھے پر چڑھایا اور بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگی۔ خیال ہی رہا اور ہنڈیا کے جلنے کی مہک ہر طرف پھیل گئی۔ واپس کچن میں پلٹی اور ہاتھ سے ڈھکن ہٹانے کی کوشش کی تو ہاتھ بری طرح جل گیا۔ اپنی تکلیف بھول کر مائرہ ہنڈیا ٹھیک کرنے کی فکر میں لگ گئی۔ دوسری ہنڈیا میں اسے انڈیلا جلا ہوا حصہ الگ کیا اور دوبارہ اسے بھوننے لگی۔

اتنی برق رفتاری سے کام کرنے کے باوجود مائرہ کام سمیٹ نہ پائی تھی کہ فیضان کی آمد کا بگل بج گیا۔ پہلی مرتبہ اسے فیضان کے اتنی جلدی آنے پر کوفت ہوئی۔ یہ اتنی جلدی آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی دوست ہی راستے میں مل جاتا۔ موٹر سائیکل ہی پنکچر ہو جاتی۔ کچھ بھی ہو جاتا بس ایک دو گھنٹے اور مل جاتے۔ بے دلی سے وہ فیضان کے لئے دروازہ کھولنے گئی تو ہونق سے چہرے پر مسکراہٹ لانا بھی اسے منافقت لگی۔

تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود فیضان نے گھر میں داخل ہوتے ہی جلنے کی ہمک محسوس کر لی۔ گویا اب اور طرح کے سرپرائز ملا کریں گے! اس نے مایوسی سے سوچا۔ دراصل اس وقت وہ بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ارسلان کا دل گھر میں داخل ہوتے ہی بجھ گیا تھا۔ وہ پرسکون گھر نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ جلا ہوا کھانا کھاتے ہوئے وہ بیزاری کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''اس سے زیادہ میں نہیں کر سکتی۔'' مائرہ بھی پھٹ پڑنے کو تیار تھی۔ ایک اکیلی جان ہوں۔ کہاں کہاں دیکھوں۔ اب بغیر ملازمہ کے کام نہیں ہو سکتا۔'' مائرہ باقاعدہ لڑنے کے موڈ میں تھی۔

''تو رکھ لو ملازمہ...... اب تو تم خود کماتی ہو۔ میں تو اتنا ہی کر سکتا ہوں جو میرے بس میں ہے اب ڈاکے ڈالنے سے تو رہا۔'' فیضان نے

بیزاری سے بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔

''ہاں دے دوں گی تنخواہ.....تمہاری محتاج نہیں ہوں۔'' مائرہ بھی بڑبڑائی۔لیکن آج گھر کے ماحول سے وہ خود بہت دلبرداشتہ ہوئی تھی۔ کہاں سب ہنستے بولتے، چہکتے ہوئے اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ آج کھانے کے بعد فائزہ اسکول کی کاپیاں چیک کرنے بیٹھ گئی۔ارسلان کی مرضی تھی کہ مما اسے ہوم ورک کرائے۔

''بھئی ارسلان اب تم بڑے بچے ہو گئے ہو اپنا کام خود کیا کرو۔'' مائرہ نے اسے ٹالتے ہوئے کہا اور کاپیوں کے انبار پر نظر ڈالی جو کسی صورت چیک ہونے پر نہ آ رہا تھا اور صبح اسے یہ سب کام واپس کرنا تھا۔

''مائرہ! ایک کپ چائے مل جائے گا؟'' فیضان چائے کے بہانے حالات بہتر کرنا چاہتا تھا۔اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب رات گئے تک دونوں چائے کا لطف لیتے اور خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔

''میرے پاس ٹائم نہیں.....'' مائرہ نے بے اعتنائی سے کہا اور اسکول کی کاپیاں چیک کرنے لگی۔

فیضان بے مزہ ہو کر تھوڑی دیر ٹی وی چینل گھماتا رہا اور پھر خاموشی سے سونے چل دیا۔

مائرہ نے فیصلہ کر لیا کہ اب ملازمہ رکھے بغیر چارہ نہیں۔ ادھر اُدھر تانک جھانک کر ایک کام والی سے معاملہ طے ہو گیا۔ دراصل اتنی صبح آنے کیلئے کوئی خاتون تیار نہ تھی۔ جب یہ مان گئی تو مائرہ کو غنیمت لگا اس نے گھر ملازمہ کے حوالے کیا اور اپنی جاب پر چلی گئی۔ پہلے روز مائرہ نے آ کر گھر کا دروازہ کھولا تو حیران رہ گئی۔تمام گھر صاف تھا۔کچن میں برتن دھلے ہوئے تھے۔ بستروں کی چادریں سلیقے سے بچھی تھیں۔ کھانے کی میز صاف تھی۔خوشی اور اطمینان سے فائزہ کچن کی طرف بڑھی تاکہ بچوں کیلئے روٹی بنائے لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دوپہر کی روٹیاں پکی رکھی تھی۔

اب فائزہ کو نوکری کرنا زیادہ مشکل نہ لگ رہا تھا۔صبح صبح شازیہ آ جاتی سب کا ناشتہ بنا کر دیتی اور بعد میں گھر بار سمیٹتی رہتی۔ فیضان میں بھی اب وہ آشفتہ سری نظر نہ آتی تھی۔اس نے مائرہ سے وابستہ بہت سی توقعات ختم کر دی تھیں۔بچوں نے ماں کی مصروفیت سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور سب نے اپنی اپنی دنیا الگ بسا لی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ مائرہ ہی اس گھر کا وہ محور تھی جو سب کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھی۔فیملی ٹائم کا تصور اب گھر میں تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مائرہ کو مصروف دیکھ کر فیضان دوستوں کے ساتھ نکل جاتا اور بچے ٹی وی سے دل بہلاتے۔

گھر پر اب دو ملازمائیں تھیں۔ مائرہ کی ذمہ داریاں اس کی تنخواہ کے حساب سے بڑھتی رہیں۔اب وہ سینئر سکول کی انچارج تھی۔ پوری برانچ کی ہیڈ کے طور پر بھی اس کا نام تجویز ہو چکا تھا۔وقت بڑا ظالم ہوتا ہے۔ ہر خواہش کی قیمت وصول کرتا ہے۔ بظاہر دو تنخواہوں سے گھر کے حالات بہت سنبھل چکے تھے۔ بچے اچھے سکولوں سے تعلیم حاصل کر کے پروفیشنل اداروں میں آ گئے تھے۔مگر غیر محسوس طور پر وقت نے اس سٹیٹس کی بڑی قیمت وصول کی تھی۔ مائرہ کی چھوٹی سی دنیا کے گنے چنے مسائل گویا ایک بڑے کینوس پر منتقل ہو گئے تھے۔ اسکول میں انتظامیہ کی سیاست کا سامنا، بہتر کارکردگی کی ٹینشن، خود کو فٹ اور اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لئے بازاروں کے چکر، پھر گھر پر ملازماؤں کے ساتھ چخ چخ، کوئی بغیر بتائے چھٹی پر ہے تو کسی کی طرف سے بے ایمانی اور اچکے بن کے مسائل ہیں۔نوجوان لڑکی ہے تو چار جگہ آنکھ مٹکا لگا رکھا ہے اب سرے سے جواب دے گئی ہے تو نئی ڈھونڈیں۔کئی بار تو ایسا ہوا کہ مائرہ عاجز آ گئی اور سنجیدگی سے جاب چھوڑنے کا سوچنے لگی۔ایسے ہی کسی کمزور لمحے میں اس نے فیضان سے تذکرہ کیا تو اس کے جواب پر گویا سن ہو کر رہ گئی۔

''ارے اب تو بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔اب جاب چھوڑ کر کیا کرو گی! اور پھر اکیلی میری تنخواہ سے گھر کا خرچ کیسے پورا ہو گا۔''

کہاں تو اس کا خیال تھا کہ فیضان خوشی سے کھل اٹھے گا اور کہاں یہ جواب! وہ مرجھا ہی تو گئی۔اسے لگا کہ وہ بیوی جسے دیکھ کر گزرے وقت میں فیضان جیسے جی اٹھتا تھا، اب اس کی حیثیت اس کے نزدیک محض پیسے کمانے کی مشین کی ہے۔ پھر مائرہ نے چپ چاپ اپنی اس نئی حیثیت کو قبول کر لیا۔ بچے اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ارسلان نے ہاسٹل کو ترجیح دی اور بوریا بستر سمیٹ کر چل دیا۔ فائزہ شام ڈھلے

یونیورسٹی سے آئی اور اپنے پراجیکٹس میں مگن ہو جاتی یا سو رہتی۔

مائرہ کی جسمانی توانائیاں کمزور پڑنے لگی تھیں۔ اب وہ بری طرح تھک جاتی اور اکثر بیمار رہنے لگی تھی۔لیکن کوئی اسے دیکھنے والا نہ تھا۔ اس دنیا کی دوڑ میں وہ پیار کرنے والے سب رشتے کھو بیٹھی تھی۔ جب سب اس کی محبت اور توجہ کے طالب تھے تو مائرہ کے پاس ان کے لئے فرصت نہ تھی اور اب جب سب لوگ اپنے جذبوں میں سرد ہو گئے تھے تو مائرہ کا جی چاہتا کہ کوئی اس کے پاس بیٹھے، اس سے باتیں کرے۔

سر میں درد محسوس کر کے فائزہ نے ایک پیالی چائے بنائی اور ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔آج اسکول سے اس نے چھٹی لی تھی تا کہ آرام کر سکے۔ ٹی وی پر قرآنی آیات کی تلاوت اور ترجمہ چل رہا تھا۔

’’کہا تم نے، اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی کھانے پر، پکارو اپنے رب کو کہ وہ نکالے ہمارے لئے زمین سے سبزی، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا کیا تم بدلنا چاہتے ہو اس سے جو کم تر ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے۔‘‘

مائرہ نے ٹی وی بند کر دیا۔ آنسو لگا تار اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ کاش وہ من و سلویٰ پر راضی ہو جاتی۔ جو شوہر کی محبت، بچوں کی چاہت، خوشی اور قہقہے اس گھر میں تھے، وہ قدرت کا عطیہ من و سلویٰ ہی تو تھے۔ مائرہ نے زندگی کو ترجیح دی اور بدل لیا اس سے جو کم تر تھا اس کے بدلے جو بہتر تھا۔

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ

بہانہ

''کیا ان کی پہلے بھی کبھی ایسی حالت ہوئی ہے؟'' ڈاکٹر وقاص نے محسن صاحب سے سوال کیا۔ ''جی پچھلے سال انہوں نے ایک رکشہ کا بڑے ٹرالے سے ایکسیڈنٹ ہوتے دیکھا پھر جب ان کے سامنے ہلاک شدگان کو نکالا گیا اور کچھ زخمیوں کی چیخ وپکار سنی تب بھی دو تین دن ان کی ایسی ہی حالت ہوئی تھی۔'' محسن صاحب نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''اوہ......'' ڈاکٹر محسن ایک دم معاملہ سمجھ گئے...... ''مریضہ کو آئی سی یو میں ٹریٹ منٹ دینے کے بعد ہم ان کے کچھ ٹیسٹ لیں گے، حتمی طور پر تو اسی وقت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن آپ فکر مند نہ ہوں بہت زیادہ صدمے کی حالت میں یہ بھی سکتے کی ایک کیفیت ہے انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ویسے اب یہ واہگہ کس کے ساتھ گئی تھیں؟'' ڈاکٹر محسن نے سوال کیا۔

''اپنے نواسے کے ساتھ، شیخوپورہ سے محرم کی چھٹیوں میں آیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے واہگہ پر پرچم اتارنے کی تقریب دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ مجھے باٹا پور میں کچھ کام تھا انہیں بٹھا کر واپس گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ دھماکے سے جیسے زمین آسمان لرز گئے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ کس قیامت صغریٰ کا سا سماں تھا۔ چیخیں، شور، ہر طرف موت ہی موت تھی۔ یہ شکر ہے کہ نواسہ کے معمولی سا زخم آیا ہے بازو پر، لیکن ان کی یہ حالت ہے جو ظاہر ہے بہت تکلیف دہ ہے۔'' انہوں نے اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر شروع کیا جو گزشتہ بارہ گھنٹے سے پھٹی آنکھوں اور کھلے منہ کے ساتھ لیٹی تھیں۔ بولنا بلانا تو دور کی بات وہ تو جیسے ہوش وحواس سے بھی بیگانہ تھی۔ گھر والوں کی پوری کوشش کے باوجود منہ کا دہانہ بند کیا جا سکا نہ آنکھیں زندگی کی طرف آئیں۔ ان کی آنکھوں میں بیک وقت خوف، دہشت، دکھ، اذیت، ہیبت کی تصویر مجسم تھی......!

ڈاکٹر وقاص تو فائل لے کر آئی سی یو میں چلے گئے اور محسن صاحب گھر والوں کو ڈاکٹرز کی رپورٹ کے بارے میں رپورٹ دینے گئے۔ چند منٹوں کے بعد ڈاکٹر محسن اور ایک نرس تیزی سے اندر آئے اور محسن صاحب کو مخاطب کر کے بولے۔

''محسن صاحب اللہ کا شکر ہے پیشنٹ ہوش میں آ گئی ہیں بہت حد تک اور نارمل ہو چکی ہیں امید ہے ایک آدھ گھنٹے کے بعد انہیں ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ تاہم یہ ٹیسٹ آپ ضرور کروالیں۔''

محسن صاحب نے بے اختیار شکر ادا کیا اور وارڈ میں دوسرے زخمیوں کی خبر گیری کے لئے چلے گئے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اپنی بیگم کے ساتھ گھر جاتے ہوئے ان کا رواں رواں شکر گزار تھا۔ زندگی سے موت کا سفر ایک لمحے کے ہزارویں حصے کا ہی تو ہے گو کاتب تقدیر نے سب کچھ پہلے سے لکھ رکھا ہے تاہم نواسے کا سوچتے ہی انہیں جھرجھری سی آ گئی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو ان کی بیٹی کے ہاں کیا قیامت نہ بیت جاتی...... ایک اکلوتا تو بچہ تھا ان کا...... فیصلہ رب کا مان کر بھی ساری زندگی بیٹی اور داماد کے مجرم بنے رہتے۔

گھر میں بچوں نے ماں کو اپنے قدموں پر چل کر آتا دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ بچپن چھپن جانے والوں میں ان کی ماں شامل نہیں تھی یہ اللہ کا کرم تھا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا لیکن ماں نے ہونٹوں پر قفل لگا لئے۔ شام گزر گئی۔ رات...... موسم سرما کے ابتداء کی طویل رات بھی گزر گئی۔ اگلی صبح بھی طلوع ہوگئی۔ انہیں بلانے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ اگر ایک سٹیچو کی شکل میں ماں کا پورا منہ آٹھ گھنٹے کھلا دیکھنا اذیت تھی تو اس منہ کو بند کر کے زبان پر دس من وزنی قفل ڈالنا اذیت ناک تھا۔

بہو، بیٹیوں، شوہر سب نے اپنی سی کوشش کر دیکھی لیکن بے سود۔ ناشتے کے بعد محسن صاحب بیٹے کے ہمراہ گھر سے نکلے۔

''فوزیہ بیٹے ہم ذرا عمران صاحب کی طرف جا رہے ہیں......

گیٹ بند کر لینا......'' انہوں نے نکلتے ہوئے بہو کو مخاطب کیا۔

''ابو آپ دو کلو پیاز لے آئیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بھئی دس محرم کی وجہ سے مارکیٹ بند ہے......''

بند ہونٹوں کا قفل ٹوٹا۔ زندگی میں حرکت پیدا ہوئی۔ محسن صاحب کی بیگم کسی شیرنی کی طرح غراتے ہوئے پیچھے بھاگیں۔

آج دس محرم ہے...... خدا کے لئے گھر سے باہر مت جائیں۔''

سب کے سب گھر والے حیران رہ گئے۔

سب کو بغیر کہے سنے پتہ تھی۔ اس لئے باپ بیٹا دونوں سر جھکا کر واپس آ گئے۔ کچھ دیر کے بعد ان کی پوتی کو نوٹس لینے پڑوس میں جانا تھا...... پھر وہی ڈرامہ...... ''نہیں آج کوئی نہیں جائے گا......'' ان کے لہجے میں التجا ہی التجا تھی...... درخواست تھی...... الفاظ بن کہے بتا رہے تھے کہ موت کے جس وحشی رقص کو وہ واہگہ کی پریڈ میں دیکھ کر آئی ہیں اس سے ڈر کر آج وہ کسی کو گھر سے نہیں جانے دیں گی۔ ظہر کی اذان ہوئی۔ کسی فرد کو باجماعت نماز کی اجازت نہ ملی...... محسن صاحب نے دونوں بیٹوں اور پوتوں کو صف میں کھڑا کر کے فوری امامت کا فرض ادا کر دیا۔

محسن صاحب کی بیگم عصر مغرب کے دوران ٹینشن سے پھر بے چین ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں...... دونوں کانوں پر انہوں نے ہاتھ رکھے تھے۔ جیسے ابھی سے بم پھٹنے کی آواز آئے گی......

''امی آپ تھک جائیں گی۔ بیٹھ جائیں ناں۔ فوزیہ نے منت سماجت کی اتنے میں گیٹ کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی۔

''ارے کوئی باہر تو نہیں چلا گیا آج دس محرم ہے......'' وہ ننگے پاؤں بھاگیں ''نہیں بھئی کوئی باہر نہیں گیا......'' محسن صاحب نے انہیں دیکھ کر واہگہ بارڈر کے زخمی اور ہلاک شدگان کی تصاویر والا اخبار فولڈ کر کے ایک طرف رکھا۔

اللہ اکبر...... اللہ اکبر...... قریبی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز آئی جسے سنتے ہی محسن صاحب کی بیگم دھپ سے صوفے پر بیٹھیں اور بولیں۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے...... آج کا دن خیریت سے گزر گیا اور......''

بے ساختہ ایک چیخ کی آواز پر سارے گھر والے دوڑے۔

''ارے یہ کون چیخا ہے؟''

''یہ کس کے گرنے کی آواز آئی ہے۔''

''اف!'' محسن صاحب کی چیخ نکلی۔

فائزہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بیگم محسن کا ایک دفعہ پھر منہ کھلا ہوا تھا اور وہ سکتے کی حالت میں تھیں ان کے بیٹے کا واٹر پمپ چلاتے ہوئے ننگی تار پر پاؤں پڑ گیا تھا۔

زندگی ہار گئی تھی...... موت آنے کا بہانہ گھر ہو یا قلعہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

بازگشت

ٹپ ٹپ ٹپ......

اسے پتہ ہی نہ چلا یہ رم جھم کب شروع ہوگئی۔ وہ تو عمران کی ڈائری پڑھ رہی تھی۔ اب اس کی اداس اور تنہا زندگی میں یہ ڈائری ایک دوست، رازدار اور معالج کی حیثیت اختیار کرگئی تھی یہ اس کے بیٹے عمران کی ڈائری تھی جو شادی کے بارہ سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے رب نے عطا فرمایا تھا۔ نوال اور آفتاب اسے پا کر پھولے نہیں سماتے تھے۔

نوال کی تابی کی محبت پر بھروسہ تو تھا۔ لیکن جب سال پہ سال گزرتے گئے تو وہ یہی سوچتی کہ اب وہ دوسری شادی کرلیں گے۔ گھر والوں، دوستوں حتیٰ کہ اس کے ڈاکٹر دوست نے مشورہ دیا کہ تم دوسری شادی کرلو۔ اللہ پاک نے تمہیں حق دیا ہے۔ مرد تو چار شادیاں کرسکتا ہے۔ پھر اولاد تو ایک نعمت ہے کس کا دل نہیں چاہتا کہ اس کا آنگن بچوں کی کلکاریوں سے گونجے مہکے آباد ہو۔ مگر اس نے ایک ہی جواب دیا کہ اگر میرا رب بڑھاپے میں حضرت ابراہیمؑ کو اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور حضرت ذکریاؑ کو یحییٰؑ جیسا بیٹا عطا کرسکتا ہے تو وہ مجھے اس بیوی سے اولاد دے گا۔

☆......☆......☆

پھر سوہنے رب نے اس عاجز بندے کی بات کی لاج رکھ لی۔ نوال نے ڈائری بند کردی اور اپنی زندگی کے گزرے واقعات ایک ایک کرکے دہرانے لگی۔

پورے بارہ سال بعد عمران جیسا چاند ہمارے گھر میں طلوع ہوا ہمارے گھر میں تو خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔ بیٹا کب مسکرایا اس نے پہلا قدم کب اٹھایا، کب بولنا سیکھا، کب ماما کہا، کب پاپا کہا، ہر بات کی تصویر......اس کی پہلی سالگرہ فائیو سٹار ہوٹل میں منائی گئی کیا لوگوں کی شادیوں پہ اتنی رونق اور اتنا ہیوی مینیو ہوتا ہوگا جو عمران کی سالگرہ پہ تھا۔ نوال کی نگاہوں میں وہ سارے مناظر ایک ایک کرکے جھلملا رہے تھے آنسوؤں کی رم جھم میں اور بھی خوبصورت لگ رہے تھے۔ جب خوشی کا موسم ہوتا ہے تو وقت تو جیسے پر لگ جاتے ہیں۔ میں اتنی مصروف ہوگئی۔ دنیا کو بھول گئی، بس میری دنیا آفتاب اور عمران بیٹے نے کب کھانا ہے، کب سونا ہے، کب اسے نہلانا ہے، کیا پڑھنا ہے، کب سکول جانا ہے، اسے لینے کون جائے گا، اس کی ٹیوشن، اس کا سکول، لنچ بکس، بستہ، کتابیں، اس کے کپڑے، اس کا کمرہ، اس کے کھلونے۔ اس کی مسکراہٹ سے دل کا سکون اور آنکھوں کی چمک وابستہ تھی۔ اسے چھینک بھی آجاتی تو ڈاکٹروں کی لائن لگ جاتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے عمران نے اولیول کا امتحان پاس کرلیا۔ آفتاب کا ارادہ تھا کہ اے لیول کرنے کے بعد اسے یوکے پڑھنے کیلئے بھیجے اور وہ ہارٹ سپیشلسٹ بنے گا۔ لیکن میں نے کہا کہ میں کیسے اس کے بغیر زندہ رہوں گی۔ میری تو بیٹے میں جان ہے غرضیکہ بحث مباحثہ، مشورہ کرتے کرتے اس کے باہر جانے کا وقت سر پر آپہنچا۔ میری آنکھیں نم رہنے لگیں۔ میں نے کہا کہ میرے ویزے کیلئے بھی اپلائی کریں۔ آفتاب نے کہا میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ یہ بھی سوچو، اتنا بڑا گھر، نوکر چاکر، ذمہ داریاں، تمہیں دونوں میں کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ میرا دماغ آفتاب کے ساتھ تھا اور دل عمران کے ساتھ۔ میں نے کہا آفتاب ہم دونوں بیٹے کے ساتھ چلتے ہیں۔ دو ہفتے کیلئے اس کو سیٹ کرکے واپس آجائیں گے میرے دل کو تسلی ہوگی کہ وہ اچھی جگہ رہ رہا ہے۔ وہ مان گئے۔ ہم نے آفتاب کے دوست عثمان جعفری کو اطلاع دی وہ لینے آئے۔ دوسرے دن کالج گئے پتہ چلا کہ ایک سال پری میڈیکل میں لگانا ہوگا۔ مجھے افسوس ہوا کہ بیٹے کا ایک اور سال ضائع ہوگا۔ پانچ سال ایم بی بی ایس اور پھر چار سال سپیشلائزیشن ......اب ایک سال پری میڈیکل......دس سال......

سوچا ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے جینے کیلئے کتنے وسائل کی ضرورت ہے وہ تو سب ہمارے پاس ہیں۔ زمینیں، دو گھر، گاڑیاں، بزنس......لیکن ہم......انسان کیا چاہتے ہیں۔ ہمارے نفس میں ایک میٹر فٹ ہوتا ہے انا کا، برتری کا، دوسروں پر فخر جتانے کا...... یہ کیسا احساس ہے، جذبہ ہے، نفسانی خواہشات ہیں ہم ان سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے سامنے دس سالوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ جذبات کی، محبت کی، جدائی کی دل کی، ضرورتوں کی۔ وائے انسان! اس نے زندگی کو کیا بنا دیا......اپنے نفس کا غلام بن کر رہ گیا۔ عمران کو بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس کی ہر بات کا خیال رکھا تھا وہ بیمار ہو گیا اور چھٹی لے کر واپس آ گیا وہ مرجھا گیا تھا ڈاکٹر کا خیال تھا کہ کوئی بیماری نہیں ہے گھر سے دوری اور تنہائی کی وجہ سے ڈپریشن سا ہے۔ دوائی دیں ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے کہا اب میرا بچہ واپس نہیں جائے گا یہاں کے میڈیکل کالج میں داخلہ دلوائیں۔

ہماری خوب لڑائی ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار آفتاب نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا کہ اپنے لاڈ پیار کی وجہ سے میرے بیٹے کی زندگی خراب کرے گی وہ ذہین ہے، لائق ہے، محنتی ہے، میرا اکلوتا بیٹا اور میرا وارث ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیم کیوں نہ حاصل کرے۔ ہم کنوئیں کے مینڈک ہیں، باہر نہیں نکلنا......جاہل اور کم ظرف عورت......

میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا عورت تیری یہ اوقات ہے!

باپ کے گھر سننے کو ملا کہ بیٹی پرائی امانت ہے اور شوہر کا گھر اس کا گھر ہے۔ یہاں پتہ چلا یہ مرد کا گھر ہے۔ عورت نے جانا کہ شاید اولاد اس کی ہے وہ بھی باپ کی وارث ہے، اس کے نام کو آگے بڑھائے گی۔ تو پھر اے عورت......تو کہاں ہے کس گنتی میں ہے کس شمار، قطار میں ہے...... تیرے حقوق صرف کتابوں کے کالے حرف......اور دانشوروں اور ادیبوں کے زبان سے نکلے ہوئے الفاظ...... جو ہوا میں تحلیل ہو گئے اور سننے والوں نے تالیاں بجا بجا کر داد دی۔

ساری زندگی کی خدمت، اطاعت، محبت، جگ راتے...... قربانیاں ان کا کوئی، بدل، اجر، ثواب، صلہ...... یا سب کچھ اگلے جہان کی آس اور امید میں جمع ہو گیا۔

عورت آخر کسی مقام اور احترام کی تمنا ہی کیوں کرتی ہے۔ اللہ پاک اور اس کے پیارے رسولؐ نے جو مقام دیا ہے وہ تو یہ دنیا دینے کو تیار نہیں تو نوال میں کیا کروں؟

اپنے ہونٹوں کو سی لو...... اندھی، گونگی، بہری بن جاؤ۔ لیکن دل...... یہ تو مچلے گا، روئے گا، تڑپے گا، جاگے گا اور جگائے گا۔ اس کا کیا علاج کروں...... کئی دنوں کی ذہنی، روحانی، جذباتی، تکلیف اور کشمکش کے بعد اس نے ہار مان لی......اس نے ساری محبتیں دیں۔ پہلی دفعہ کھل کر برستی بارش کے ساتھ روئی اور جھل تھل ہو گیا۔ منظر صاف ہوتے ہی اس کو ایک راستہ دکھائی دیا، روشن، کھلا، شفاف آسودگی اور راحت بخشنے والا...... واقعی دل ٹوٹنے کی تکلیف تو بہت ہوتی ہے لیکن راستے ضرور دکھائی دینے لگتے ہیں۔

زندگی کے 45 سال گزارنے کے بعد اس نے کیسی وارفتگی اور شوق سے مصحف حقیقی کو کھولا۔ وہ جوں جوں قرآن پڑھتی گئی اسے قرار آتا گیا۔

یہ مال اور اولاد تو چند روز کا کھیل تماشا ہے۔ یہ آخرت میں تمہارے کام نہیں آئے گا۔ وہاں کی کرنسی تو ایمان اور اعمال ہیں اے میرے رب تیرا شکر یہ تو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، مجھے گرنے نہیں دیا اپنے حصار سے بڑھنے اور مقام سے گرنے نہیں دیا۔ آفتاب تمہارا شکریہ! تم نے ایک ہی وار سے میرے دل میں رکھے ہوئے سارے بت توڑ ڈالے، محمود غزنوی کی طرح...... میں تو ساری عمر ان بتوں کو ہی پوجتی رہی، اسی کو اپنی دنیا سمجھ لیا۔ تمہارا کتنا بڑا احسان ہے۔

حیرت ہے نا......ہمیں دنیاوی زندگی میں جس شخص کی جو بات سب سے بری لگتی ہے، دل چاہتا ہے اس سے نفرت کریں، اس کو ذلیل کریں، اسے کچا چبا جائیں، وہی بات ہماری نجات کا باعث ہوتی ہے، ہمیں پار لگا رہی ہوتی ہے۔ ہمیں تو ایسے انسان کا سو ہزار بار شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ کہ یہ واقعہ ہمیں منزل تک پہنچائے گا،

وہ منزل جسے ہم بھولے بیٹھے ہیں، یہ تماشا جو آنکھوں کے سامنے

دن رات ہو رہا ہے یہ واقعی تماشا ہے اس کو حقیقت نہ جانیں۔ یہ سازوسامان، کاروبار، گھر اور گاڑیاں، یہ محبت اور رشتے ......بس ایک ٹھوکر یا ایک ہچکی کے محتاج ہیں۔ پھر آنکھیں بند...... یا آنکھیں کھل......

شکر ہے کہ نوال تیری آنکھیں کھل گئیں یہ مال اور اولاد تو دنیاوی زندگی کی رونق ہیں۔ یہ آخرت میں تمہیں ذرا بھی خدا سے یا آگ سے نہیں چھڑا سکتے۔ اپنے ایمان اور اعمال کی خیر مناؤ جس سے تم بے خبر ہو۔ کہیں اس بے خبری میں موت آ گئی تو خسارہ ہی خسارہ ہے۔ پھر میں نے زبان بند کر لی اور تلاوت شروع کر دی۔ خود ہی مزاج میں ٹھہراؤ آ گیا۔ تلخی کہیں غائب ہوتی گئی مزاج میں سنجیدگی آ گئی۔ عمران واپس پڑھنے چلا گیا۔ میری آہ وفریاد ہی تو اس کی راہ کی رکاوٹ تھی۔ اب میں اسے فون پر تسلی دیتی، چند سالوں کی بات ہے۔ میرا بیٹا لائق فائق ڈاکٹر بن کر آ جائے گا۔

وہ شخص آفتاب جسے زعم تھا کہ وہ مجھے نہ صرف جانتا ہے بلکہ محبت کرتا ہے، اسے میرے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا پتہ ہی نہ چلا۔ نہ اس نے پوچھا نہ میں نے بتایا، میں اپنے فرائض پوری ایمانداری سے انجام دیتی رہی۔ ابھی دو سال باقی تھے کہ عمران اپنے فون میں کسی لڑکی ماریہ کا ذکر کرنے لگا۔ وہ بہت اچھی ہے۔ ہم دونوں سیر کیلئے گئے تھے۔ ماریہ کافی بنا رہی ہے۔ اب ہم نے عمران کو ایک کمرے کا فلیٹ لے دیا تھا تاکہ وہ سکون سے پڑھائی کر سکے۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ بیٹے ماریہ ہوسٹل میں رہتی ہے اس کے والدین میرا مطلب ہے گھر کہاں ہے۔ وہ بولا۔ وہ یہاں لندن میں ہی رہتی ہے لیکن اب ہوسٹل میں شفٹ ہوگئی ہے گھر میں پڑھائی نہیں ہوسکتی۔

کیا وہ انگریز ہے؟ اس کا مذہب کیا ہے؟ میں نے پوچھا تو وہ چپ ہوگیا۔

امی میں نے پوچھا نہیں۔ مجھے مذہب سے کیا لینا دینا ہے۔ وہ میری کلاس فیلو ہے بس، میری دوست ہے۔

چندا...... دوست بنانے سے پہلے دیکھنا تو پڑتا ہے کہ وہ کون ہے......

اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بائے۔

میرا دل تو ایک برف خانہ تھا۔ جونئی بات ہوئی ایک برف کی سل کی طرح دل میں سٹور ہو جاتی۔

میرا اللہ ہے نا......اور پھر یہ تو کھیل تماشا ہے۔

اس کے بعد اس نے ماریہ کا ذکر نہ کیا میں نے پوچھا تو کہہ دیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ میں بھی مان گئی۔ فائنل ایئر میں تھا تو اس کے دوست کا فون آیا کہ اس کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے وہ کسی مریض کو غلط انجکشن لگا رہا تھا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

آفتاب بولے یہ تو سراسر سازش ہے کہ ابھی ٹیکہ لگا ہی نہیں اور پولیس کو خبر بھی ہوگئی، وہ آ بھی گئے اور رنگے ہاتھوں پکڑ لیا کوئی اسکا دشمن ہے۔

ہم دونوں تیسرے دن لندن کیلئے روانہ ہو گئے میں نے دو دن پہلے پڑھا کہ جو تم سے چھن جائے اس پر غم نہ کرو اور جو نعمت تمہیں مل جائے اس پر غرور نہ کرو۔

وکیل سے بات کی اس نے کہا کیس تو تب لڑا جا سکتا ہے جب پولیس اسے عدالت میں پیش کرے۔ ابھی تک تو ابتدائی تفتیش ہو رہی ہے۔ ہمیں کسی صورت ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ جس پر اس کے کلاس فیلوز نے پاکستانی سفارت خانے کے آگے جا کر احتجاج کیا۔ بینرز اٹھائے ہوئے تھے عمران کو اس کے والدین سے ملنے دیا جائے...... برطانیہ کا ہیومن رائٹس کمیشن کہاں ہے۔ یہ زیادتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ماریہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی، پتہ چلا وہ آئر لینڈ چلی گئی ہے۔ وہاں رابطہ کیا وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میکسیکو خالہ کے ہاں جا چکی تھی۔ کسی کے پاس اس کا کنٹیکٹ نہ تھا۔

آٹھ دن بعد ہمیں ہوٹل میں فون ملا کہ عمران جیل کی ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ آئی سی یو میں ہے آپ اسے مل سکتے ہیں۔

پہلے اس کی آزادی اور اب جان کی فکر پڑ گئی۔ مجھے یاد آیا جو لوگ مصیبت میں صبر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ان کے لئے اللہ کی رحمت ہے میں نے دل ہی

دل میں اس آیت کو دہرانا شروع کر دیا عمران بے ہوش تھا، یا قومے میں تھا، یہ بیماری تھی، تشدد تھا، زہر تھا...... یہ پتہ نہ چل سکا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بس اس نے کھانا کھایا اس کے بعد بے ہوش ہو گیا۔ ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ اب بلڈ لیا ہے۔ سی ٹی سکین کیلئے لے کر جا رہے ہیں۔ ایم آر آئی ہونا ہے۔ بس ہم تو ملاقاتی کمرے میں بیٹھے رہتے اور عمران کی بے ہوش ٹرالی آتی جاتی رہتی۔ ہم بند گلی میں پھنس گئے تھے۔ میں نے کہا ہم اس کو پاکستان لے جاتے ہیں۔ آفتاب بولے یہاں کا علاج زیادہ قابل اعتبار ہے اور اس کی جو حالت ہے اس کو کیسے شفٹ کریں گے میں نے صبر کی دعا پڑھنی شروع کر دی۔ ایک دن اس کے ہوسٹل کے زمانے کا روم میٹ رضا ملنے آیا اور کہنے لگا۔ چلیں ہسپتال سے باہر کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ وہ ہمیں ریجنٹ پارک لے گیا اور کہنے لگا، ایک یہودی لڑکی تھی ماریہ۔ عمران اس کے بہت قریب تھا۔ مگر اس کو ایک ہندو نریندر بھی پسند کرتا تھا۔ پھر ماریہ تو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اسے بھی نریندر نے ہی غائب کیا ہو گا۔ کئی دفعہ عمران اور نریندر کا جھگڑا بھی ہوا ہے۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ اس لئے اس نے آپ سے کہا تھا کہ اسے فلیٹ لے دیں۔ کیونکہ ہوسٹل میں وہ غیر محفوظ تھا۔ ہم نے یہ معلومات پولیس کو دیں تو انہوں نے بتایا کہ نریندر پچھلے تین ماہ سے انڈیا گیا ہوا ہے۔ تفتیش کا سرا ہاتھ آیا تھا مگر کچھ نہ ہوا ایک ہفتے بعد عمران نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ہم اس کی میت لے کر واپس آ گئے۔

فخر وغرور، مستقبل کے خواب...... چکنا چور سپنے لے کر آئے اور اسے مٹی کے سپرد کر دیا کیونکہ وہ اسی مٹی کی امانت تھا کتنی تھوڑی زندگی لے کر آیا تھا۔ کاش وہ یہ آخری سال ہمارے ساتھ گزارتا۔ ہم اس کی خوشیاں شیئر کر سکتے۔ اس کی شادی کرتے۔ اس کے سر پر سہرا دیکھتے۔ میرے پاس صرف صبر اور دعا کا سہارا ہے، یہ سہارے نہ ہوتے تو میں ہوش وحواس کھو بیٹھتی۔

☆......☆......☆

دردِ لا دوا

وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی۔جبھی بچوں کے کھیلتے کھیلتے لڑنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔اس نے پہلے تو نظر انداز کیا لیکن جب آوازیں بڑھتی چلی گئیں تو اسے اپنے برتن دھوتے ہاتھ کو روکنا پڑا۔اس نے پٹخنے کے سے انداز میں صابن اور پلیٹ کو سنک میں رکھا اور صابن لگے ہاتھوں سے ہی باہر آئی۔تینوں بچے اب باقاعدہ اونچی آوازوں سے ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟ کیوں چیخ رہے ہو تم لوگ؟'' وہ غصے سے پوچھ رہی تھی۔

''امی میں نہیں سب سے زیادہ بھائی چیخ رہا ہے۔'' منیٰ، اپنے سے دو سال بڑے شاہ زیب کی طرف اشارہ کرتے ہی بولی۔

''کیوں بھئی کیا مسئلہ ہے؟ کیوں محلے والوں کو اپنی آواز سنا رہے ہو؟'' اب فائقہ شاہ زیب کی طرف مڑی۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔'' شاہ زیب نے بگڑے تیوروں سے بہن کو دیکھا۔

''آخر یہ لڑائی ہو کس بات پر رہی ہے، ضرور تم لوگوں نے ایک دوسرے کی چیزیں لی ہوں گی۔'' فائقہ نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں امی یہ بات نہیں ہے۔آج صبح پپا نے کہا تھا نا کہ شام کو میں تمہیں پارک لے جاؤں گا تم لوگ سوچ کر رکھنا کہ کہاں جانا ہے تو بس، منیٰ کہہ رہی ہے الہ دین پارک، لیکن بھائی کہہ رہا ہے، سند باد، چلیں گے، اس کے دوست بھی وہیں جاتے ہیں، جب کہ میں کہہ رہی تھی......''

ابھی یمنیٰ کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ہی فائقہ کی طبیعت بگڑنے لگی۔

''امی آپ کو کیا ہو رہا ہے؟'' تینوں اپنی لڑائی بھول کر اس کی طرف بڑھے تھے۔مگر فائقہ نے انہیں صابن لگے ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا تھا۔اس کو چکر آنے شروع ہو گئے تھے۔

''خاموش ہو جاؤ تم لوگ۔'' اس نے سہارے کے لئے دیوار کو تھامنا چاہا۔بچوں نے جلدی سے ماں کو تھام کر قریب پڑے تخت پر بٹھا دیا، لیکن وہ بیٹھی نہیں آڑی ترچھی لیٹ گئی۔

''امی، امی'' تینوں روہانسے ہو گئے تھے۔ماں کی طبیعت کی خرابی ان کے لئے نئی نہ تھی۔ہر چند ماہ بعد فائقہ کو اس طرح دورے پڑتے تھے۔

''جاؤ یہاں سے، دفع ہو جاؤ۔'' فائقہ نے دھکیلنے کے انداز میں تینوں کے ہاتھوں کو پیچھے ہٹایا۔

''جاؤ'' وہ زور سے چیخی تھی۔تینوں ہی ڈر کر ایک دم پیچھے ہٹ گئے تھے۔شاہ زیب نے فوراً ہی باپ کو فون ملایا تھا۔منیٰ بھاگ کر برابر والی آنٹی کو لے آئی تھی۔

''اوہ، فائقہ کو آج پھر......'' پڑوس کی آنٹی فوراً ہی آ گئی تھیں ''اٹھو فائقہ'' انہوں نے فائقہ کو ہلایا جلایا، اٹھو شاباش'' انہوں نے سہارا دے کر فائقہ کو اٹھایا، ''ارے اس کے تو ہاتھ بھی خراب ہو رہے ہیں'' آنٹی نے اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس کو اپنے ساتھ لگا کر پہلے ہاتھ دھلوائے اور پھر دروازے تک لے گئیں جہاں ان کا بیٹا گاڑی کی چابی لئے انہی کا منتظر تھا۔وہ فائقہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی تھیں۔

''بچو! پپا گھر پر ہے اس کے پاس چلے جاؤ یا چاہو تو گھر میں ہی رہو۔میں تمہاری امی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔'' برابر والی آنٹی نے بچوں کو ہدایت کی اور فائقہ کو لے کر ڈاکٹر کو دکھانے نکل گئیں۔سارا راستہ فائقہ سر پٹختی اور اپنے بال نوچتی رہی۔اس کی ذہنی کیفیت خراب ہو رہی تھی۔

فائقہ کو ڈاکٹر دیکھ ہی رہا تھا کہ اس دوران عامر بھی آفس سے کلینک پہنچ گیا۔

''کیا ہوا فائقہ کو؟'' وہ پریشانی سے آنٹی سے پوچھ رہا تھا۔

''وہی......دورہ پڑا ہے۔'' آنٹی آہستہ سے بولیں اور عامر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ فائقہ کی ذہنی کیفیت وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگا دیا تھا اور اب دوائیاں لکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے فائقہ کو آرام کا اور پابندی سے دوائیاں دینے کی ہدایت دے کر پرسکون رکھنے کا مشورہ عامر کو دیا۔ جس کے جواب میں عامر سر ہلا کر رہ گیا اور تینوں اس نفسیاتی کلینک سے باہر آ گئے۔ واپسی کا سارا راستہ فائقہ آنکھیں بند کئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے چپ چاپ سوچوں کے سمندر میں غرق رہی۔ آنٹی سارا راستہ اس کا ہاتھ اور بازو سہلاتی اسے جیسے پرسکون رکھنے کی خاموش تلقین کر رہی تھیں اور شکر کر رہی تھیں کہ اسے فوری ڈاکٹر کو دکھا دیا گیا تھا ورنہ فائقہ اس حالت میں بالکل قابو سے باہر ہو جاتی تھی۔

☆......☆......☆

اطلاعی گھنٹی کی آواز پر سعدیہ نے دروازہ کھولا۔ تینوں بچے اسکول سے آ گئے تھے۔ تینوں ہی بیگ سنبھالتے بھاگے بھاگے اندر آ گئے تھے۔ سعدیہ نے دروازہ بند کیا اور ان کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ ''کیسا ہوا پیپر؟'' بچوں کے ماہانہ ٹیسٹ ہو رہے تھے۔

''اچھا ہوا میرے خیال سے مجھے سینٹی نمبر تو ضرور مل جائیں گے۔'' اشعر نے سب سے پہلے جواب دیا۔

''اور میرا، اشو سے زیادہ اچھا ہوا ہے، میرے تو ہنڈرڈ میں سے ہنڈرڈ آئیں گے۔'' بلی بھائی کو چڑاتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔ دونوں اوپر تلے کے بہن بھائی تھے۔ دوستی بھی بہت تھی مگر نوک جھونک بھی خوب جاری رہتی۔ ''امی گڈو کہاں ہے۔'' اس نے تین سالہ گڈو کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔

''سو رہا ہے، آہستہ بولو ورنہ اٹھ جائے گا، اور یہ کیا تم آتے ہی لپٹ گئیں الگ ہو، جاؤ کپڑے بدلو، پنکی بیٹا تم بھی جاؤ۔'' سعدیہ نے پانچ سالہ پنکی سے کہا جو وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ماں کے کہنے پر ناچار پنکی اٹھی اور بہن بھائی کے پیچھے ہولی۔

کھانے کے دوران بھی بچے اپنے اسکول کے قصے ماں کو سناتے رہے اور رضیہ ہوں ہاں کر کے بچوں کی گفتگو میں شامل تھی۔

''پنکی کھانا کھاؤ، اتنی دیر ہوگئی تمہاری پلیٹ جب سے ایسے ہی رکھی ہے۔''

''بس کھا چکی۔'' وہ بولی اور دسترخوان سے اٹھ گئی۔

''ارے یہ کیا اپنی پلیٹ تو صاف کرو۔'' مگر وہ ان سنی کر کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ''جاؤ بلی سے لے کر آؤ میں اسے کھانا کھلاؤں۔'' سعدیہ نے دس سالہ بلی سے کہا تو وہ بہن کو بلانے اٹھ گئی۔ اسی دوران کمرے سے گڈو کے رونے کی آواز آئی تو وہ اسے دیکھنے کے لئے بھاگی۔ گڈو کو اگر ماں آنکھ کھلتے ہی نظر نہیں آتی تھی تو وہ خوب شور مچاتا تھا۔ دوسری طرف بلی پنکی کو منا کر لائی کہ وہ اپنا کھانا پورا کرے لیکن سعدیہ تو گڈو کو بہلا رہی تھی، پنکی دو نوالے کھا کر پھر بھاگ گئی۔ بلی مجبوراً خود ہی کھانے بیٹھ گئی۔ اشعر اور بلی نے کھانا کھا لیا تھا تب سعدیہ گڈو کو لے کر دوبارہ دسترخوان پر آئی۔

''یہ پنکی نے کھانا نہیں کھایا؟'' وہ بڑے دونوں سے پوچھ رہی تھی۔

''امی میں نے پنکی سے بہت کہا لیکن......''

''نہیں کھاتی تو نہ کھائے، اب میں کس کس کو دیکھوں؟'' سعدیہ نے بلی کی بات کاٹ کر جھلاتے ہوئے کہا اور گڈو کو کھانا کھلانے کی کوشش کرنے لگی۔ ساتھ ہی بڑبڑاتے ہوئے خود بھی کھانے لگی۔

''میں آپ سے اتنی دیر سے کیا کہہ رہی ہوں آپ نے میری بات سنی بھی؟'' سعدیہ، میاں سے کہہ رہی تھی جو فائلوں میں سر دیئے دفتری کام میں منہمک تھا۔

''ہاں سن لیا اب میرا دماغ نہ کھاؤ، مجھے کام کرنے دو۔'' وہ رجسٹر میں کچھ لکھتے ہوئے مصروف انداز میں چڑ کر بولا۔

''کیا خاک سنا، پانی کی موٹر دو دن سے خراب ہوئی پڑی ہے، بچوں کی ٹیوٹر الگ تقاضے کر رہی ہے اسے دو ماہ کی تنخواہ ایڈوانس میں چاہیے۔ گڈو کو موشن لگے ہیں، اتنا تنگ کر رہا ہے، چڑچڑا ہو گیا ہے۔ اب میں اکیلی کیا کیا دیکھوں؟ آپ سے کہو تو سنتے ہی نہیں، ہر وقت ان کمبخت کاغذوں میں ہی گھسے رہیں گے، یہ دفتر کا کام وہیں کیا کیجئے گھر میں نہ لایا کریں۔''

''اگر میں اتنا کام نہ کروں تو تم لوگ جو اتنی عیاشی کرتے ہو وہ سب ختم ہو جائے۔'' وہ فائل غصے میں پٹختے ہوئے بولا ''بے وقوف عورت ہر وقت میرا سر کھاتی ہے، اس کے علاوہ کچھ کام ہی نہیں۔'' حبیب اب تیز آواز میں بولا تھا۔

''ہاں کچھ کام تھوڑی ہے، بے وقوف اور پاگل جو ہوں۔'' سعدیہ میاں کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے کچھ فاصلے پر بیٹھے ٹی وی دیکھتے تینوں بچوں کو دیکھا۔

''یہ تم لوگ ہر وقت ٹی وی کیوں دیکھتے رہتے ہو، اسکول کا کام کرتے دم نکلتا ہے۔ جاؤ کمرے میں صبح اسکول جانا ہے لیکن یہاں مزے سے ٹی وی دیکھا جا رہا ہے۔''

اب وہ میاں کا غصہ بچوں پر اتار رہی تھی۔ ماں کو شدید غصے میں دیکھ کر بلی نے جلدی سے ٹی وی بند کیا۔ تینوں آگے پیچھے خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔ پنکی بھی بہن کا بازو تھامے سہمی ہوئی بھاگ گئی تھی۔

☆......☆......☆

فائقہ انجکشن کے زیر اثر تھی لہٰذا گھر آ کر عامر نے پڑوسن آنٹی کی مدد سے پہلے دوائیاں دیں اور پھر اسے بستر پر لٹا دیا۔ فائقہ جلد ہی نیند کی وادی میں چلی گئی تھی۔ عامر نے بچوں کو ماں سے دور رہنے کی ہدایت کی اور کپڑے وغیرہ بدلنے واش روم میں گھس گیا۔ آنٹی بھی کچھ دیر بچوں کے پاس بیٹھ کر اور انہیں شور نہ مچانے کی تلقین کر کے اپنے گھر چلی گئیں۔ بچے کھیل کود بھول کر ایک دوسرے سے جڑے خاموش خاموش ڈرے ڈرے تھے۔ اور ماں کی اس طبیعت خرابی میں اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھ رہے تھے۔ عامر کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا تو بچے خاموش دبکے بیٹھے تھے۔

''پپا، امی کو کیا ہوا؟'' چھوٹی یمنیٰ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں بیٹا، بس تھوڑا سا بخار ہے، کچھ دیر آرام کریں گی تو ٹھیک ہو جائیں گی، بس آپ لوگ انہیں تنگ نہ کیجئے گا، ٹھیک؟'' وہ چہرے پر زبردستی کی بشاشت لاتے ہوئے بولا ''اچھا آپ لوگوں نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟'' اسے ایکدم خیال آیا کہ بچے بھوکے تو نہیں بیٹھے۔ جواب میں بچوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''اوہ، اچھا میں آپ کے لئے کچھ لے کر آتا ہوں۔'' عامر اٹھتے ہوئے بولا۔ پر کچھ ہی دیر میں اس نے بچوں کیلئے کھانا لگا دیا تھا۔ بچوں کو کھلا کر اس نے ان کا ہوم ورک کرایا۔ بچے بھی اب دوپہر والا واقعہ بھول کر کھیل رہے تھے۔ بچوں کو کھیلتا چھوڑ کر وہ کمرے میں آیا۔ فائقہ جاگ چکی تھی اور چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' وہ فائقہ کے پاس بیٹھتا نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے جواب میں سر ہلایا اور عامر کی طرف سے کروٹ لے لی جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ عامر بھی خاموش ہو گیا۔ کتنے ہی لمحے چپ چاپ سرک گئے تھے۔

''فائقہ'' عامر نے لہجے میں زمانے بھر کا پیار سمو کر اسے پکارا، اور اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تب فائقہ نے بھی آہستگی سے کروٹ لے لی۔ اب وہ عامر کے سامنے تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ عامر کا ہاتھ اب اس کے بالوں کو سنوار رہا تھا۔

''جو ہوا بھول جاؤ، ایک برا خواب سمجھ کر۔''

''لیکن وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی، بہت بھیانک'' فائقہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''دیکھو، تمہارا ایک گھر ہے، بچے ہیں میں ہوں، اس میں ہمارے بچوں کا تو کوئی قصور نہیں، نا، تم دیکھو تمہاری اس حالت کو دیکھ کر وہ کتنا سہم جاتے ہیں اور میں! میں کتنا پریشان ہو جاتا ہوں، اپنے اس گھر کی خاطر اپنے آپ کو پرسکون رکھا کرو، اگر تم ٹھیک رہو گی نا تو ہم سب......''

ابھی عامر بات کر ہی رہا تھا کہ فائقہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ رگڑتی اٹھ بیٹھی۔ پھر اس نے پیر میں چپل پھنسائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے کیا ہوا؟ کہاں جا رہی ہو؟'' عامر اس طرح اسے اچانک اٹھ کر کمرے سے باہر جاتے دیکھ کر چونکا۔

''جا کر کچن کو دیکھوں، پیاس لگ رہی ہے پانی پیوں گی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''میں لا دیتا ہوں تم آرام کرو۔'' عامر بھی اس کے پیچھے اٹھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں لے لوں گی، اب ٹھیک ہوں'' وہ بے رخی سے بولتی باہر نکل گئی تھی۔

☆......☆......☆

حبیب دفتر سے گھر آیا تو اس کا مزاج خراب تھا۔ دفتر میں اس کی اپنے کولیگ سے کچھ منہ ماری ہوگئی تھی۔ گھر آ کر اس نے اپنا بیگ ایک طرف پھینکا اور جوتے موزے اتار کر یونہی صوفے پر ڈھ گیا۔ ''سعدیہ جلدی سے چائے لے کر آؤ۔'' اس نے بیوی کو آواز لگائی۔ سعدیہ گڈو کے ساتھ مصروف تھی۔ اس نے سن تو لیا تھا لیکن وہ گڈو کو فارغ کر کے ہی اٹھی۔ اگر گڈو کو یونہی چھوڑ دیتی تو وہ گیلے کپڑوں میں بھاگ جاتا۔ اور اس کو ٹھنڈ لگی ہوئی تھی، سینہ بھی کافی خراب تھا۔

''کتنی دیر سے چلا رہا ہوں چائے دے دو لیکن یہاں سنتا ہی کون ہے۔'' حبیب جو پہلے ہی بھنایا ہوا تھا اب تیز آواز میں بولا۔

''سن لیا تھا، گڈو کو کپڑے بدلوا رہی تھی۔'' وہ بھی تلخی سے بولی۔

''تو کیا کپڑے بدلوانے میں گھنٹوں لگتے ہیں، بس کام نہ کرنے کا بہانہ ہونا چاہیے۔''

''بہانہ ہے تو وہی سہی۔'' وہ ماتھے پر بل ڈالے کچن میں چلی گئی۔ جلد ہی وہ حبیب کے لئے چائے بنا لائی تھی۔ اس نے حبیب کے آگے چائے رکھی۔

''گھر کو تو دیکھو کتنا بکھرا پڑا ہے جب دفتر سے آؤ سارا گھر پھیلا ہی ہوتا ہے۔'' اب وہ اپنا غصہ دوسرے طریقے سے ظاہر کر رہا تھا۔

سارا دن گھر اور بچوں کو ہی لگی رہتی ہوں، کوئی سیر و تفریح نہیں کرتی، صفائی والی کام کر کے جاتی ہے اور بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد گھر پھر وہی پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ ابھی ٹیوٹر پڑھا کے گئی ہے تو بچوں کی کتابیں اس لئے یہاں پھیلی پڑی ہیں۔ اتنی دفعہ کہتی ہوں کہ باجی کے جانے کے بعد کتابیں بیگ میں رکھا کرو، اب نہیں سنتے تو کیا کروں، کمرے میں گڈو کو کپڑے بدلوا رہی تھی وہاں اس لئے اس کے کپڑے پھیلے ہیں۔ کچن میں ابھی ببلی اپنے لئے آلو وغیرہ بنا رہی تھی یوں کچن بھی اس نے پھیلا دیا۔ اب بچوں والا گھر تو اسی طرح پھیلا رہتا ہے میں اکیلی جان کہاں تک کروں؟''

سعدیہ بگڑتے تیوروں کے ساتھ بچوں کی پھیلی کتابیں بھی سمیٹ رہی تھی اور میاں کو وضاحت بھی دیتی جا رہی تھی۔

''جتنا زبان چلاتی ہو اتنا ہاتھ بھی چلا لو تو گھر صاف رہے اور یہ تم نے چائے بنائی ہے ٹھنڈی اور کڑوی، تمہیں تو ان گیارہ سالوں میں ڈھنگ کی چائے بنانی بھی نہیں آئی، صاف کہہ دو نہیں بنانی تو بازار سے ہی پی لیا کروں، تم کو تکلیف نہ دوں۔''

وہ چائے کی پیالی غصے سے پرچ میں پٹختے ہوئے بولا جس سے نہ صرف پیالی لڑھک گئی اور چائے میز پر بہہ گئی بلکہ پرچ بھی ٹوٹ گئی۔

''ہاں نہیں بنانی، گھر کیا آتے ہیں، عذاب آ جاتا ہے ہر وقت اعتراض، چیخنا چلانا، آخر میں کیا کروں؟'' سعدیہ نے بھی حلق پھاڑا تھا۔

''ہاں عذاب ہوں نا میں، بہت جلد میں تم کو اس مصیبت سے نجات دلانے والا ہوں۔ طلاق دے رہا ہوں میں تم کو، جاؤ نکلو میرے گھر سے۔'' حبیب غصے سے دھاڑا تھا اور گھر سے نکل گیا۔

سعدیہ اپنی جگہ گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔ اگرچہ حبیب ہمیشہ سے ہی غصے کا تیز تھا لیکن وہ آج یہ قدم اٹھائے گا، یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ نہ صرف اس کی بیوی بلکہ اس کے چار بچوں کی ماں بھی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ اس طرح کھڑی رہی، پھر تھک کر قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن صدمے اور طیش کے مارے ابل رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔

دوسرے کمرے میں چاروں بچے والدین کے آئے دن کے جھگڑوں کے عادی تھے اور اور اس وقت بھی سہمے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائے نیچے قالین پر بیٹھے تھے۔ پنکی اور گڈو بھی ببلی سے چمٹے ہوئے تھے اور ببلی اللہ میاں سے دعا کر رہی تھی کہ جلدی سے اس کے امی ابو کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ سعدیہ اس واقعہ کے بعد پچھلے تین دنوں سے بچوں کے کمرے میں ان کے ساتھ سو رہی تھی۔ حبیب سے اس کی بات چیت تقریباً بند تھی۔ دونوں بہت ضروری گفتگو ہوتی تو ایک دوسرے سے ہمکلام ہوتے ورنہ ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے۔ ایک طلاق دینے کے بعد حبیب کو کچھ ملال بھی تھا۔ نہ جانے کیسے غصے میں اس سے یہ الفاظ نکل گئے تھے جس پر اب وہ شرمندہ بھی تھا۔ سعدیہ سے اس سلسلے میں کچھ معذرت کرنا چاہتا تھا لیکن سعدیہ کا سخت رویہ اسے کچھ بھی کہنے سے

روکے ہوئے تھا۔اس کے برعکس گزشتہ تین دنوں سے سعدیہ کے دل و دماغ میں ایک جوار بھاٹا اٹھا ہوا تھا،اس کے اندر کی تپش اسے کسی طرح چین نہیں لینے دے رہی تھی۔حبیب کی طرف سے دی گئی طلاق اس کے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ ان دونوں کے اس سے پہلے بھی لاتعداد جھگڑے ہو چکے تھے لیکن ان کریہہ الفاظ کی نوبت ان کے بیچ کبھی نہ آئی تھی۔اب جبکہ حبیب نے یہ الفاظ منہ سے نکال ہی لئے تھے تو ایک لاوا تھا جو اندر ہی اندر پک رہا تھا اور کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔

☆......☆......☆

فائقہ اپنے معمول پر لوٹ چکی تھی۔روزمرہ کے کام نبٹاتی ،میاں اور بچوں کے ساتھ اسی طرح روٹین کی بات چیت۔لیکن ایک خلش ، ایک پچھتاوا، ایک کسک اس کی ہر سانس کے ساتھ تھا۔اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ اندوہناک واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ آج بھی اس کے قلب وذہن میں تازہ تھا۔وہ اسے کبھی نہ بھلا سکتی نہ ماضی میں اور نہ ہی مستقبل میں۔

فائقہ کی یہ حالت عامر سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔جب فائقہ اس حالت کا شکار ہوتی وہ اس کی وحشی آنکھوں اور آنسوؤں سے تر چہرے کے خدوخال میں اپنی اس خوش مزاج اور سدا مسکرانے والی بیوی کو ڈھونڈتا، جسے اس نے اپنی بے حد پسند کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ یونیورسٹی میں اسے یہ نرم خو اور ذہین لڑکی بے حد متاثر کرتی تھی۔اس کا باوقار انداز اور آنکھوں سے جھانکتی اداسی عامر کو اپنی طرف کھینچتی۔وہ اکثر خاموش رہتی تھی مگر جب بات کرتی تو نہایت شائستہ اور اطوار میں بے حد شریف لگتی۔ پھر اس نے اپنے بڑوں کے ذریعے فائقہ سے رشتے کی بات چلائی اور اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیا۔دونوں ایک دوسرے کے لئے بہت اچھا انتخاب ثابت ہوئے۔ اللہ نے ان کو صحت مند اور خوبصورت اولاد سے نوازا اور آٹھ برسوں میں تین بچوں کی کھلکھلاہٹ سے ان کا آنگن بھر گیا۔ عامر کا دل اکثر اپنے رب کے حضور شکر کے جذبات سے لبریز ہو جاتا تھا۔

''مگر زندگی کا یہ رخ کتنا بھیانک ہے......کتنا تکلیف دہ!'' وہ اکثر سوچتا اور اس کی بھیگی نگاہیں فلک پر ٹک جاتیں جیسے وہ رب سے سوال کر رہا ہو۔

☆......☆......☆

''ابو اتنے سارے دن ہو گئے ،آپ ہمیں کہیں سیر کے لئے نہیں لے کر گئے۔'' سب رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ اشعر نے حبیب سے تفریح کی فرمائش کی تھی۔جواب میں حبیب نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گردن اثبات میں ہلائی جس کا مطلب تھا کہ وہ بچوں کو لے چلے گا۔

''ہاں ابو، کہیں اچھی سی جگہ لے کر چلیں۔'' ببلی والدین کا موڈ نارمل دیکھ کر جوش سے بولی۔''ابو میں بھی جاؤں گی۔'' پنکی معصومیت سے بولی۔

''ہاں ہاں ،میری بیٹی تو سب سے پہلے ہے،سب چلیں گے۔'' حبیب شفقت سے بولا۔اور سب نے خوشی خوشی کھانا مکمل کیا۔سعدیہ اس دوران خاموش ہی رہی۔اس نے باپ اور بچوں کے درمیان کوئی مداخلت نہ کی۔کھانے کے بعد وہ تو کچن سمیٹنے میں لگی رہی اور بچے ،باپ کے پاس گھس کر پروگرام بنانے لگے۔اشعر اور ببلی پروگرام طے کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔گڈو باپ کی گود میں بیٹھا اس کی چابیوں اور گھڑی سے کھیل رہا تھا جبکہ پنکی کندھے سے لگی بڑے شوق اور دلچسپی سے ببلی کو سیر کیلئے جانے کا پروگرام بناتے دیکھ رہی تھی۔دونوں بچے اب جگہ کا تعین کرنے کے بعد کھانے پینے کی چیزیں سوچ رہے تھے کہ وہاں جا کر کیا کیا کھایا جائے گا، دہی بڑے، چاٹ، گول گپے، آئسکریم۔

''ابو کیوں نہ صبح چلیں، ہفتہ ہے، ہماری اسکول کی چھٹی ہے۔'' ببلی نے اچانک شوشا چھوڑا۔

''او کے،صبح ہی کو چلتے ہیں۔'' حبیب نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ اس نے ببلی کے کہنے پر مسکرا کر حامی بھر لی۔اشعر اور پنکی باپ کے راضی ہوتے ہی خوشی سے اچھل پڑے اور شور مچانے لگے۔تینوں کی خوشی دیدنی تھی۔گڈو بھی بہن بھائی کو خوش دیکھ کر خوشی سے چیخنے لگا۔

''کیا پاگل ہو گئے ہو تم چاروں جو رات کے اس ٹائم چیخ چلا رہے ہو۔''

کچن سے شور سن کر سعدیہ باہر آئی اور بچوں کو اچھلتے دیکھ کر غصے سے بولی۔

''امی آپ کو پتہ ہے ہم سب صبح پکنک پر چلیں گے۔'' بلی بہت پرجوش تھی۔ ابو نے اس کی بات فوراً مان لی تھی اور یہ خوشی اس سے سنبھل نہ رہی تھی۔

''کیوں؟ کل کون سا ایسا خاص دن آ گیا؟ اور کون لے کر جا رہا ہے؟ سعدیہ کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''ابو اور کون'' وہ مسکرائی، سعدیہ کی تلخی اس نے اپنی خوشی میں محسوس ہی نہ کی۔

''کیوں کیا تمہارے ابو دفتر سے فارغ ہو گئے؟'' سعدیہ نے نفرت سے میاں کو دیکھا اور تنفر سے بولی حبیب کی طرف سے طلاق دیئے جانے کا صدمہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا بجائے اس کی تکلیف میں کمی ہونے کے شدت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ بچے اس کی بات سمجھے نہ تھے لیکن حبیب نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہا لیکن پھر سر جھٹک دیا، وہ سعدیہ کے اس رویے کو سمجھ رہا تھا جو کہ اس کی طرف سے کی گئی غلطی کا ردِعمل تھا۔ ''میں کل دیر سے دفتر چلا جاؤں گا۔'' حبیب پنکی کے بال سنوارتے ہوئے لاتعلقی سے بولا۔

''یہ مہربانی کس لئے؟'' سعدیہ کا لہجہ اب بھی تمسخر بھرا تھا۔ ''چلو بچو، جاؤ، بہت دیر ہو گئی۔ پھر صبح اتنی دیر تک سوتے رہتے ہو۔ کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے اس گھر کا۔'' وہ گڈو کو گود میں اٹھاتی اور پنکی کا ہاتھ پکڑتے بولی۔

''ابو صبح کتنے بجے تک چلیں گے۔'' بلی پوچھ رہی تھی۔

''کوئی کہیں نہیں جا رہا، سمجھ میں آیا تم لوگوں کے۔'' سعدیہ بولی اور بچوں کو کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔

''صبح سات بجے اٹھ جانا تم لوگ۔'' حبیب نے پیچھے سے آواز لگائی اور پاس پڑا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے اخبار واپس پٹخا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ سعدیہ اگرچہ شروع سے ہی مزاج کی تیز تھی لیکن آج کل وہ جس تندی کا مظاہرہ کر رہی تھی یہ حبیب کے لئے بھی ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر اسی طرح ٹہلنے کے بعد وہ کمرے میں سونے چلا گیا۔

صبح سعدیہ کے اٹھنے کے بعد بچے بھی اٹھ گئے تھے۔ حبیب نے جب بچوں کے کمرے میں جھانکا تو اشو اور بلی آنکھیں کھولے ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک طرف اگر وہ باپ کے ساتھ چلنے پر خوش ہو رہے تھے تو دوسری طرف ماں کی ناراضگی بھی انہیں ڈرائے دے رہی تھی۔ باپ کو کمرے میں دیکھتے ہی دونوں نے بستر سے چھلانگ ماری اور اس سے لپٹ گئے۔

''ابو ہم واقعی پکنک پر چلیں گے؟'' اشو پوچھ رہا تھا۔

''کیوں نہیں چلیں گے، آخر رات کو پروگرام جو بنایا تھا۔'' وہ اشو کے کندھے کو تھپکتے ہوئے بولا۔

''لیکن ابو امی بہت غصہ کریں گی، انہوں نے رات کو منع جو کر دیا تھا۔'' بلی ڈرتے ڈرتے بولی۔

''امی کیوں منع کریں گی، تم امی سے کہو وہ بھی تیار ہو جائیں اور جلدی سے نہاؤ دھوؤ پنکی کو اٹھاؤ پھر ناشتہ کر کے چلیں گے۔'' حبیب نے بلی کے گال تھپتھپائے اور کمرے سے نکل گیا۔

بچے خوشی خوشی تیار ہوئے واش روم میں گھس گئے۔ بلی نے پنکی کو جگایا تو وہ بھی جانے کا سن کر فوراً اٹھ گئی۔ اب صرف گڈو رہ گیا تھا۔ اسے چونکہ سعدیہ نے ہی تیار کرنا تھا لہٰذا بلی نے اسے نہ اٹھایا۔ سعدیہ کا موڈ شاید کچھ بہتر ہو چکا تھا اسی لئے اس نے بچوں کو تیار ہوتا دیکھ کر کچھ نہ کہا اور خاموش ہی رہی۔ بچے بھی اس کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر جلدی جلدی تیار ہو رہے تھے مبادا پھر کہیں ماں انہیں جانے سے روک لے۔ اس دوران گڈو بھی اٹھ چکا تھا سعدیہ نے اسے بھی صاف ستھرا کر دیا تھا۔ اب سب بچے اور حبیب ناشتہ کر رہے تھے اور سعدیہ کچن میں بے مقصد کھڑی تھی۔

''امی آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں، آپ بھی تیار ہو جائیں۔'' اشو نے ماں سے کہا۔

''میں کہیں نہیں جا رہی تم لوگوں نے جانا ہے تو جاؤ۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''مگر امی آپ کے بغیر ہمیں مزہ نہیں آئے گا۔'' اب کے بلی نے بھی زبان کھولی۔

''کیوں میرے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کیا فرق پڑتا ہے تم لوگ تفریح کرو، جاؤ، میں تو ایک فالتو شے ہوں، ناکارہ...... تمہارے

باپ نے مجھے میری اوقات یاد دلا دی ہے، میرا کام اس گھر کی چاکری کرنا ہے اور کچھ نہیں اور میں اپنی ڈیوٹی نبھا رہی ہوں۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے چھیڑنے کی دیر تھی اور وہ پھٹ سی پڑی تھی۔

''کیوں الٹی سیدھی بکواس کر رہی ہو۔'' حبیب چڑ کر بولا۔

''ابھی بکواس کی ہی کب ہے'' ابھی تو صرف سچ بولا ہے جو تیر کی طرح لگا ہے جب اور سچ اگلوں گی تو نگل نہ سکو گے تم۔'' سعدیہ نے کینہ توز نظروں سے حبیب کو دیکھا۔

''میں اگر برداشت کر رہا ہوں تو تم حد سے نہ بڑھو۔'' حبیب نے ہاتھ میں پکڑا چمچہ دیوار پر دے مارا۔

''میں حد سے بڑھ رہی ہوں یا'' اور ان دونوں کی لڑائی بڑھتی چلی گئی۔ بچے سہمے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ناشتہ کرنا تو جیسے سب بھول چکے تھے۔

''ابھی تو میں نے تم کو صرف ایک طلاق دی ہے ابھی اگر دو اور دے دوں تو تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہو گی۔ کوئی تم پر تھو کے گا بھی نہیں۔'' حبیب حلق کے بل چلایا تھا۔

''تو یہ شوق بھی پورا کر لو، مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو نا تمہارا یہ ارمان میں پورا نہ ہونے دوں گی اس سے پہلے ہی میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں گی۔'' ایک آتش فشاں تھا اس کے لہجے میں جو پھٹ رہا تھا۔

ہاہ......کیا کر لو گی تم، کر ہی کیا سکتی ہو؟'' حبیب نے طنزاً اس کا مذاق اڑایا تھا۔

''میں...... میں......'' غصے کی زیادتی سے سعدیہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے وہ کمرے سے تیر کی طرح نکلی تھی، اور چند ہی لمحوں میں جب وہ واپس پلٹی تو اس کے ہاتھ میں حبیب کا لائسنس یافتہ پستول تھا۔ ''میں مار ڈالوں گی تم کو، میں سب کو مار دوں گی۔'' سعدیہ وحشیانہ انداز میں بولی تھی۔

سعدیہ......، پپ پاگل ہو گئی ہو، رکھو اس کو' حبیب اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر فق ہو گیا تھا۔ لیکن سعدیہ تو جیسے جنونی ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

فائر کی پے در پے چھ آوازیں محلے والوں کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھیں۔ اڑوس پڑوس کے کتنے ہی لوگوں نے حبیب کے گھر کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ کسی نے پولیس کو بھی فون کر دیا تھا۔ وہ بھی موقع پر پہنچ گئی تھی۔ اور پھر ایک ناقابل یقین اور دردناک منظر سب کے سامنے تھا۔ میاں بیوی اور تین بچے موقع پر ہی ہلاک ہو چکے تھے۔ صرف ایک بچی زندہ بچی تھی۔ اس نے اہل محلّہ اور پولیس کو بیان دیا تھا اور گھر میں ہونے والے واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔ بچی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ہسپتال میں تھی۔ گولی اس کے کندھے کو صرف چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔

''کاش، کاش میں اس دن ابو سے پکنک کا نہ کہتی یا پھر صبح امی سے ہی چلنے کا نہ کہتی تو شاید پھر یہ حادثہ نہ ہوتا۔ امی، ابو، اشو، پنکی اور گڈو۔''

ایک سسکی اس کے منہ سے نکلی اور اس نے اپنے سینہ کو پکڑ کر منہ سے نکلتی چیخوں کو روکا۔

''یا پھر میں بھی اسی دن مر جاتی تو اس یاد کو لے کر روز روز تو نہ جیتی مرتی۔ گولی تو مجھے بھی ماری گئی تھی تو پھر میرا ہی نشانہ کیوں چوکا؟''

فائقہ عرف ببلی نے آہستہ سے اپنے کندھے کو چھوا جس میں سے اٹھنے والی ٹیسیں آج بھی اس کو خون کے آنسو رلاتی تھیں۔ اور جس منظر کو یاد کر کے آج بیس سال بعد بھی وہ جنونی بن جاتی۔ کتنی ہی دوائیاں اور انجکشن لگنے کے باوجود وہ آج بھی ماضی کے اس واقعہ کو یاد کر کے بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگ جاتی تھی۔ اس کی تڑپ کا علاج شاید دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس نہ تھا۔ ماضی ایک فلم کی طرح اس کے سامنے چلنے لگتا اور اسے زہریلے نشتر کی طرح چبھنے لگ جاتا۔ از حد کوشش کے باوجود وہ اس واقعے کو کبھی اپنے ذہن سے محو نہ کر سکی۔ وہ جیسے اس کے لاشعور کا حصہ بن چکا تھا۔

''کاش وہ سب نہ ہوتا، کاش!'' فائقہ نے آنکھوں سے ٹوٹتے قطروں کو بے دردی سے صاف کیا حلق میں پھنسے گولے کو بمشکل نگلا اور دراز میں سے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی گولیاں نکالنے لگی۔

(سچے واقعے سے ماخوذ)

☆......☆......☆

فرحت طاہر

امی کی سلائی مشین

کمپیوٹر کی خرابی، بدلتے موسم میں کپڑوں کی ضرورت اور سب سے بڑھ کر سلائی کرنے والی خاتون کی محلے سے منتقلی نے اپنے ہنر کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیا۔

جی ہاں سلائی!

کپڑوں کی کٹنگ کے بعد سلائی مشین کا رخ کیا تو معلوم ہوا کہ چلنے سے انکاری ہے۔ سارے اٹکل آزما لیے مگر ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ناراضگی اس کا حق بنتا ہے کہ ہم نے اس سے بالکل ناطہ توڑ لیا ہے۔ کہیں آپ غلط نہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم نے سلائی مشین کو کباڑ خانہ میں ڈال رکھا ہے ! جی نہیں! یہ کمرے میں اسی طرح نمایاں اور روشن جگہ رکھی ہے جیسے کہ امی کی زندگی میں رہتی تھی.... اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ مختصر یہ کہ اس مشین کے لیے کسی ماہر کا انتظام کرنا پڑے گا!

چنانچہ گھر کے ہر فلور پر رہنے والے تمام باسیوں کو مسئلہ سے آگاہ کیا بلکہ متعلقہ افراد کو ٹیلی فون سے بھی مطلع کیا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ نتیجہ فوراً سامنے آ گیا جب یوم مزدور کے اگلے دن چھوٹے بھائی نے مشین کی مرمت کا عندیہ دیا جس کے لیے ہمارا جانا ضروری ٹھہرا۔ ظاہر ہے جب سلائی گھروں کے بجائے کارخانوں میں کاریگروں کے ہاتھوں ہونے لگے تو اس کے معالجین بھی اتنے عام دستیاب نہیں! چنانچہ پوچھتے پوچھتے اس جگہ پہنچے جہاں یہ سہولت میسر تھی۔ ایک بڑے سے تخت پر بیمار اور کچھ لا علاج سی مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کاریگر نے جن نظروں سے ہماری مشین کو دیکھا اور جن ہاتھوں سے چھوا، سچ پوچھیں تو ہم اس کی نیت کے بارے میں مشکوک ہو گئے۔ اپنے اس شبہے کا اظہار بھائی سے کرنے کا نہ موقع تھا اور نہ مہلت کیونکہ سب کچھ چشم زدن میں طے پا گیا۔ سروس کی اجرت پر ردو کد بھی سیر حاصل نہ ہو سکی تھی جس پر ہمارے تحفظات تھے۔

خیر مشین اس کے حوالے کر آئے۔ واپسی اگلے دن کی طے ہوئی جبکہ اتوار ہونے کی وجہ سے ہرگز امید نہیں تھی کہ وقت پر مل سکے گی۔ گھر آ کر بھی ہم مشین کے بارے میں خدشات کا شکار رہے مگر اس کا اظہار ممکن نہ تھا کیونکہ یہ ہی سننا تھا کہ لوگوں پر اعتبار کیا کریں! وہ اس پرانی مشین کا کیا بگاڑ لے گا! مگر یہ محض ایک مشین نہیں ہے ایک پوری تاریخ ہے جس میں ہمارا بچپن مضمر ہے...

ایک منظر!

بڑے بھائی کہتے ہیں جب امی ابا باہر ہوں گے اور دادی اپنے کاموں میں مصروف تو میں تمہاری گڑیا کے کپڑے سلوا دوں گا۔ اب یہ اور بات ہے کہ انہیں ہماری دلجوئی سے زیادہ مشین چلانے کی تمنا تھی۔ خیر اس مبارک گھڑی کا اختتام سوئی کے ٹوٹنے، انگلی کے زخمی ہونے اور ابا کی ڈانٹ پر منتج ہوا۔ نتیجہ؟ بھائی کی دھمکی کہ آئندہ میں تمہیں کچھ کر کے نہیں دوں گا!

ایک اور منظر منجھلے بھائی کے ساتھ ہے جنہیں میکانک سے روز اول سے دلچسپی ہے اور ہر چیز کی ماہیت تبدیل کرنے پر بڑا عبور! سلائی مشین کے حوالے سے انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ مثلاً مشین میں بجلی کی موٹر فٹ کر کے اس کی رفتار بڑھا دی تھی اور مشین کی میز میں پہیے لگا کر اسے موبائل بنا دیا تھا۔ مگر یہ تو بڑے ہو کر ہوا تھا۔ بچپن میں انہوں نے مشین کو جام پا کر ہتھوڑے سے ٹھوک ڈالا تھا! نتیجے میں اگر تشدد کے بجائے شاباشی ملتی تو ہمیں یقین ہے کہ کوئی نئی چیز ایجاد ہو چکی ہوتی.....!

ماضی سے حال میں آتے ہیں۔! اگلے دن مشین کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں سلائی کے سوا! خیر بارہ بجے کے قریب ہمارے تیسرے بھائی تشریف لائے اور فرمانے لگے مشین ٹھیک کروانی ہے نا! میں ایک کھوکھا دیکھ کر آیا ہوں ......جب تفصیل پوچھی تو معلوم ہوا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں ہم مشین دے کر آئے ہیں......مزے کی بات یہ کہ انہوں نے وہاں اپنی مشین دیکھ کر اس سے بہت بحث کی کہ یہ تو بالکل ہماری جیسی ہے.......اس لطیفے پر ہمیں اس کھوکھے پر جہاں ہم اس

مکینک کا انتظار کر رہے تھے بہت ہنسی آ رہی تھی۔

''ابھی دس منٹ پہلے تو اس کو یہیں چھوڑ کر گیا تھا.....'' بھائی نے کہا۔نیم کی چھاؤں تلے لگے تخت پر کوئی آدھ درجن مشینیں دھری تھیں ان میں ہماری مشین الگ سے چمک رہی تھی۔ اپنی جو ہوئی!! ارد گرد لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے مگر مطلوبہ فرد نہ آ رہا تھا۔ خیر وہ تشریف لائے۔ پہچان کر ہماری مشین کی طرف لپکے اور ہاتھ رکھ کر چہکے

''..بہت پیاری مشین ہے.....اب ایسی بنتی کہاں ہے!!''

اس کی لفاظی سے قطع نظر ہم سوچنے لگے ...ہے بھی تو کس پیاری شخصیت کی !اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟......اس مشین نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں بلا مبالغہ سینکڑوں جہیز، بری اور دیگر تقریبات نپٹائی ہیں.....صرف اپنی مالکن کی نہیں بلکہ دوسروں کی بلا معاوضہ خدمت کی ہے اس مشین نے !مزے کی بات یہ کہ بہت سے ایسے افراد جنہوں نے اس مشین پر سیکھا، پریکٹس کی ، پھر اس کی مالکہ کے کپڑے بھی معاوضہ پر سیے ۔جی ہاں ! اب یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے...! لمحے بھر میں درجنوں چہرے اور منظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔

''...چیک تو کر لیں...'' بھائی نے اس کی بات کاٹ کر کہا

''ہاں !'' اس نے کپڑے کی ایک دھجی ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا'' گرمی ہے۔۔۔آجکل تو لان کے کپڑے....'' ہم نے اس کی ادھوری بات کے ساتھ ہی مشین کی سوئی میں دھاگہ ڈالا۔ ہمارے اس ایکشن کو دیکھ کر اس کی زبان نے پٹڑی بدلی''....ہاں آپ کو تو سلائی بہت اچھی آتی ہے....ورنہ خواتین آتی ہیں کہ ہماری مشین ٹھیک کر و مگر دھاگہ بھی ڈالنا نہیں آتا ڈھنگ سے......''

اور ہمیں اس لمحے مشہور دانشور اشفاق احمد صاحب یاد آ گئے...... فرماتے ہیں کہ ہماری خواتین سلائی سے نہ صرف کپڑوں کو جوڑتی ہیں بلکہ اس ہنر کے ذریعے رشتوں کو بھی جوڑے رکھتی ہیں۔انسانیت کو خالق سے جوڑنا.......! جب سوئی میں دھاگہ ڈالنا نہ آئے تو.....؟ (جبھی تو گھر اور رشتے ، کنبے اور برادریاں سب کسمپرسی کی حالت میں ہیں !) اور ہمیں اپنے والدین پر بڑا فخر محسوس ہوا کہ انہوں نے ہمیں وہ بنیادی ہنر سکھایا جو انسانی رشتوں کی بناوٹ کے لیے اس درجہ اہم ہے۔مشین کے بارے میں کاریگر کی ہدایات پر سر ہلاتے ہم نے واپسی کا راستہ پکڑا۔

ایک عورت کی زندگی میں سلائی مشین کی کیا حیثیت ہے؟ یہ تو علامت ہے جو ایک ماں کی ساری اولادوں کو آپس میں جوڑے رکھتی ہے!ہمیں اپنے نئے بلاگ کے لیے موضوع مل گیا۔

چھ سال پہلے امی کا انتقال ہوا تو باوجود اس کے کہ ہم تمام بہن بھائیوں کے پاس اپنی اپنی مشینیں ہیں ہم اس مشین کو صدقہ کرنے کے فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ یہ سوچتے کہ کسی فرد یا انڈسٹریل ہوم کے لیے اس مشین سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہوگی، جب کہ ہم نے جتنے گھر شفٹ کیے ان سب کے پتے اس مشین کے کسی نہ کسی حصے میں کھدے ہوئے ہیں !چنانچہ نسبتاً نئی ری کنڈیشن مشین کو صدقہ کر کے ہم نے اسے جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ جب بھی کسی کو ضرورت پڑے یا دل چاہے اسے استعمال کر لے۔

ایک دلچسپ بات یہ کہ امی کو بہت اچھی سلائی نہیں آتی تھی بلکہ ان کا اصل ہنر بنائی (knitting) تھا۔دراصل سلائی کے لیے بیٹھنا پڑتا ہے جبکہ وہ ہر وقت حرکت میں رہتی تھیں تو ان کی اون سلائیاں ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں۔مگر پھر بھی ہم نے ہمیشہ امی کو مشین استعمال کرتے دیکھا۔تو وہ کیا سیتی تھیں آخر!جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ دراصل انہوں نے ہم دونوں بہنوں کو سلائی سکھانے پر بہت توجہ دی تھی تو ہماری حوصلہ افزائی کے لیے مشین کو ہر وقت آن رکھتی تھیں کہ اگر ماں نہ سیے تو بیٹی کہاں سے توجہ دے گی؟ بچے کو کچھ سکھانا چاہتے ہیں تو اسے صرف ہدایات دینے کے بجائے کر کے دکھائیں والا فارمولا امی کے مدنظر رہا ہوگا!

پھر بعد میں جب اس مثال بننے کی چنداں ضرورت نہ رہی تو بھی مشین سے ان کا تعلق ختم نہ ہوا۔ادھڑے، پھٹے کپڑوں کی مرمت اور ردی ٹکڑوں کو جوڑ کر کسی شکل میں ڈھالنا....یہ امی کے مشاغل تھے!مشین تو ایک استعارہ ہے مگر عورت کا بنیادی کام یہ ہی ہے۔۔۔رشتوں کو جوڑنا اور ٹوٹنے ، پھٹنے سے بچانا !انسانیت کی پھٹی ہوئی قبا میں پیوند کاری کرنا ....امی کی سلائی مشین زندہ باد!

☆......☆......☆

ممتاز بھائی

بچپن میں بے شمار چیزیں اور بہت سے خوبصورت رشتے ایسے ہوتے ہیں جو بچپن کو خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ اس کی انمٹ یادوں کی قوسِ قزح کا ایک حصہ بن کر عمر بھر جگمگاتے ہیں اور آپ جب چاہیں ان کے حوالے سے بچپن کی خوبصورت یادوں بھری فائل کے کئی صفحے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میرے بچپن کی ان یادوں میں ایک رشتہ اس کزن کا ہے جو عمر میں ہم سے کافی بڑے تھے اور اس بڑائی کی بنا پر انہیں ہم پر رعب ڈالنے کی ہر سند حاصل تھی۔ جب چاہیں ہمیں جی بھر کے روک ٹوک کر سکتے تھے، ادھر نہیں جانا، ادھر نہیں پھرنا، میری کتابوں کی ترتیب خراب نہ کرنا، اس درخت پر نہیں چڑھنا، اس پھول کو نہیں توڑنا، ان وسیع اختیارات کی بنا پر ہم ان سے بڑے مرعوب تھے اور اس عمر میں بڑے بہن بھائیوں اور کزنز پر ویسے ہی بڑا رشک آتا ہے کیونکہ بڑوں کی جس مجلس کے قریب بچوں کے پھٹکنے کی اجازت تک نہیں ہوتی وہاں انہیں بنا دستک داخلے کا شرف حاصل ہوتا ہے اور ایک عمر تک یہ خواہش دل میں کروٹیں لیتی رہتی ہے کہ کاش ان کی جگہ ہم ہوتے۔ یہ اور بات ہے جب ان کی عمر کو پہنچ کر ان مراعات سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو سوچتے ہیں بس یہ تھی وہ الف لیلہ کی داستانیں جو ہمیں تڑپاتی اور للچاتی تھیں۔

اس کزن کا نام ممتاز احمد ہے لیکن ہم انہیں ہمیشہ ''پا جی ممتاز'' کہہ کر پکارے تھے وہ رشتہ میں میرے تایا زاد بھائی لگتے ہیں۔ ان کے والد صاحب میرے والد صاحب کے پھوپھی زاد اور میری والدہ صاحبہ کے خالہ زاد تھے۔ یوں یہ دوہرے کزن اس دوہرے پن کا خوب فائدہ اٹھاتے اور ہم سب بچے بھی ان سے جی بھر کے ڈرتے بھی اور ان کی تعلیمی مصروفیات سے معصوم سے بچپن میں بہت مرعوب ہوتے تھے۔ بھائی جی کی ٹانگ میں ہلکا سا کھچاؤ جو کسی پھوڑے کی بنا پر ہوا تھا لہٰذا وہ ٹانگ کو تھوڑا سا خم دے کر چلتے تھے۔ ہر بات میں جی بھر کر خوب گرما گرم بحث کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ موضوع خواہ خالص مذہبی ہو یا بھرپور سیاسی بحث کے میدان میں کوئی مائی کا لال انہیں کلین بولڈ نہ کر سکتا تھا۔ جب بحث کا میدان گرم ہو جاتا تو سب آوازیں ان کی آواز کے بہاؤ میں بہہ جاتیں اور تھک تھکا کے سب چپ کر جاتے اور فاتحانہ انداز میں مجلس سے کسی اگلی مجلس تک کے لئے رخصت ہو جاتے۔

ان کے والد صاحب قیام پاکستان کے وقت ہندوؤں اور سکھوں کی سفاکیت کا نشانہ بن کے شہادت کا اعزاز پا گئے اور کم عمر ماں بچے کو سینے سے لگائے بیوگی کی چادر اوڑھے پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئی اور یہ سوچتے ہوئے شوہر کی شہادت پر بھی مطمئن ہو گئی کہ یہ شہادت تو میرے بیٹے کے لئے ایک خوبصورت وطن کی ضمانت ہو گی اور بچے کو پالنے میں مصروف ہو گئی۔ لیکن جانے کب اور کیوں اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ دوسری شادی کر لے اور یہ حادثہ شاید ہمارے دنیا میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے کا تھا اس لیے ہمیں تفصیلات کا زیادہ علم نہ تھا کہ انہوں نے بن باپ بچے سے ماں کی گود کیوں چھینی؟ بس اتنا پتہ ہے کہ اس بچے کو جو باپ کی رفاقت کی قربانی وطن کے صدقے کے طور پر سرحد سے پار ہی دے آیا تھا ماں سے بھی دور کر دیا گیا ماں نئے شوہر کے پاس جبکہ بچہ اپنی پھوپھو کے پاس جو غیر شادی شدہ تھی اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، رہنے لگا اور وہ بھی اسی بچے کو اپنی کل کائنات سمجھتے ہوئے پالنے لگی۔

یونہی دیکھتے دیکھتے ہم بھی بڑے ہو گئے اور جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو اس کے ردِعمل کے طور پر بڑے پتہ نہیں کیوں بوڑھے ہونے لگتے ہیں۔ بھائی اب نوکری کرنے لگ گئے پھوپھی کو بھی ہر ماں کی طرح بیٹے کی شادی کا ارمان تھا۔ بڑی کوششوں کے بعد ان کا رشتہ ایک مطلقہ جو ایک بچے کی ماں تھی کے ساتھ ہو گیا۔ وہ بڑی خوبصورت اور

سلیقہ مند عورت گھر کی رونق بن کے بھائی جی کے آنگن میں اتری اور بچہ پھول بن کے آنگن میں کھیلنے لگا۔لیکن چند ماہ بعد پتہ چلا کہ بھائی جی اپنی بیوی پر بے جا سختی کرتے ہیں اس لیے ان کے درمیان نفرت پیدا ہوگئی ہے اور نفرت تو بانس کے پودے کی طرح دنوں میں نہ صرف جوان ہو جاتی ہے بلکہ کئی مناظر جو بڑے دلکش دلربا اور پیارے ہوتے ہیں یوں نظر سے اوجھل کر دیتی ہے جیسے بادلوں کے پیچھے سورج۔

پھر پتہ چلا کہ بھابھی اپنے میکے واپس چلی گئی ہے اور پھر وہی ہوا جو اکثر ایسی صورت میں ہوتا ہے یعنی مکمل جدائی اور بڑوں سے ڈرتے ڈرتے اس سانحے کا سبب پوچھا تو پتہ چلا کہ بھائی بیوی کے پہلے بچے کے ساتھ بہت سختی کا برتاؤ کرتے تھے جو شاید اپنے خیال میں بچے کی تربیت کیلئے کرتے تھے لیکن ماں سے یہ سختی دیکھی نہ جاتی تھی سو اس بیچاری نے دوبارہ اجڑنا گوارہ کرلیا اور جس جہاں سے آئی تھی اس جہاں اپنے بچے کو سینے سے لگائے واپس چلی گئی اور بھائی پھرا کیلے رہ گئے۔کئی جگہ ملازمت کی اور بالآخر اپنی زمین پر کاشتکاری شروع کر دی۔

پھوپھو عمرِ رواں میں اپنے حصے کا وقت پورا کر کے اگلے جہاں سدھار گئیں اور بن ماں باپ کے بچے کے سر میں بھی چاندنی نے ڈیرے ڈال دیئے۔ باقی سب کزنز بھی تمدن کے میدان میں اپنے اپنے حصے کا کام کرنے کیلئے مختلف سرزمینوں کی طرف پھیل گئے یوں اسی پروگرام کا حصہ بن کے ہم بھی ہجرت کر گئے لیکن جب بھی میکے آتے تو بھائی جی کو سلام ضرور کرتے اور انہیں کسی درخت کی چھاؤں میں چارپائی ڈالے خوش وخرم کسی کے ساتھ بحث میں بھرپور مصروف دیکھتے تو یوں لگتا کہ وہ اپنی اس تنہائی پر خوش ہیں اور کوئی پچھتاوا اور حسرت نہیں۔ اکثر یہ سوچتے کہ یہ اتنی بحث کیوں کرتے ہیں کہ ایسے لگنے لگتا کہ ابھی معرکہ آرائی جنگ کا روپ دھار لے گی۔ دل ہی دل میں سوچتے کہ انہیں مشورہ دیں کہ بحث کم کیا کریں لیکن ہم بڑھاپے کی وادیوں کے آس پاس پھرتے ہوئے بھی انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ کہیں برا نہ مان جائیں اور یہ مروّتوں کے کھیل بھی ایسے ہی ہوتے ہیں کہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں پاتے کہ کہیں کسی بڑے کا دل نہ ٹوٹ جائے۔اب کی بار میکے گئی تو میکہ ویسے ہی بہت سونا تھا وہاں سے بھی ابر بہار رخصت ہو چکا تھا اور ماں کے بغیر تو میکہ پتہ نہیں کیوں اتنا سونا اور بے رنگ ہو جاتا ہے جیسے اجنبی دیس ہو وہ بہاریں اور گلزاریں جو میکے کی طرف کھچے چلے جانے کا سبب ہوتی ہیں شاید ماؤں کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی ہیں۔ وہی گھر، وہی آنگن، وہی سائبان لیکن اس ایک ہستی کے ساتھ ساری بہاریں لدی جاتی ہیں۔

ابھی صبح صبح ناشتے کا ارادہ باندھے کچن میں ہی براجمان تھے کہ باہر کچھ گہما گہمی اور شور محسوس ہوا بھتیجی نے بتایا کہ پھوپھو تایا ابو ممتاز آئے ہیں۔صحن شور سے گونج اٹھا۔ وہی بڑھک اور بحث والا انداز لیکن سوال کی صورت میں اور وہ سوال یہ تھا کہ مجھے اس پاکستان نے کیا دیا؟ اور میں یہ سوال سن کر بے قرار ہوگئی۔انہیں سلام کیا، حال چال پوچھا اور صبح ہی صبح پاکستان سے شکوہ شکایت کی وجہ پوچھی۔تو وہ یوں چھلک پڑے جیسے بھرا ہوا پیمانہ چھلک اٹھتا ہے۔ کہنے لگے میں پاکستان کو برا بھلا نہیں کہہ رہا بلکہ میں ان اربابِ اقتدار سے سوال کرتا ہوں جنہوں نے میرا باپ اور نہ جانے کتنے باپ دے کر بدلے میں پاکستان حاصل کیا تھا۔کوئی تو مجھ سے اس کی قیمت پوچھے جس کا سارا اثاثہ اس سودے میں کام آ گیا۔میرا باپ، میری محبتوں کی ساری دنیا، میری شفقتوں کا سارا جہاں اس رستے میں لٹ گیا۔میرا سارا بچپن باپ کی یاد میں گزرا اور جوانی بے رنگ سی رہی۔محبتوں سے محرومی نے پتہ نہیں کیوں اتنی تلخی لہجے میں بھر دی کہ محبتوں کے نرم و نازک جذبے مرجھا ہی گئے۔

اور بدلے میں کیا خریدا......؟ وہ پاکستان جس میں عصمتیں سبزیوں کی طرح بکتی ہیں۔

جس میں رشوت عزت کی علامت اور غربت بھوک کی ستائی ہوئی خودکشی کے دامن میں پناہ لیتی ہے۔

جہاں بدعنوانی دھوئیں کی طرح معاشرے میں پھیل چکی ہے۔

مزدور آج بھی فاقوں کی رداا وڑھے بلند و بالا عمارتوں کو تک رہا ہے۔

جہاں محنت عظمت نہیں بے بسی کا نشان سمجھی جاتی ہے۔

جہاں قانون کا ہاتھ صرف غریب کی گردن تک پہنچتا ہے۔

جہاں انصاف اتنا مہنگا ہے کہ شاعر کی بات سو فیصد سچ نظر آتی ہے۔

نہ ملتا نقد جاں دے کر بھی اک لمحہ محبت کا
گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے

ہم ہندوستان میں اپنا بہت اچھا گھر چھوڑ کر آئے تھے اور یہاں کئی عشرے ہمیں برسات میں آنگن میں بھرا پانی نکالنے میں ہی گزارنے پڑے۔ وہ یوں بول رہے تھے جیسے گہرے کنوئیں سے کوئی تھکی ماندی آواز آرہی ہو۔

وہ حساب مانگ رہے تھے اپنی انمول محبتوں کی قربانیوں کا جن کے بغیر ان کی ساری زندگی اداس گزری تھی۔ آج برسوں بعد مجھے ان کی شخصیت میں موجود خلا کا سبب سمجھ میں آیا تھا۔ کہ وہ اتنے روکھے اور پھیکے کیوں تھے۔ انہیں زندگی میں محبتوں کا جواب دینا کیوں نہیں آیا؟ نہ اپنی پالنے والی ماں کا اور نہ رفیقِ سفر کا۔ ماں باپ سے محروم بچپن کتنا گہرا گھاؤ ان کے دل میں پیدا کر گیا کہ جس پر ساری عمر میں پھاہا نہ رکھا جا سکا۔ ابھی وہ ایسے خاندان میں پلے بڑھے تھے جہاں سب ان سے اتنا پیار کرتے تھے کہ ہمیں انتہائی بچپن میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل لگتا تھا کہ ہمارے سارے عزیزوں کے گھروں میں سے ان کا اصلی گھر کون سا ہے؟ وہ جس گھر میں چاہتے بلا روک ٹوک اپنے گھر کی طرح آتے جاتے۔ لیکن وہ دل کی گہرائی جہاں وہ اپنی محرومیوں کو چھپا کر رکھتے تھے، وہاں تک شاید ماں باپ کی محبت بھری نظر ہی پہنچ سکتی ہے اور وہی اس کی ہر تشنگی تکمیل کرتی ہے۔

وہ بالکل سچ کہہ رہے تھے اور میرے پاس کوئی دلیل اور کوئی جواب نہ تھا۔ میری ساری منطقی دلیلیں جواب دے چکی تھیں اور ایک معصوم سا بچہ بچپن کی رفاقتوں سے محرومی کا حساب اس معاشرے سے مانگ رہا تھا۔ کوئی ہے جو اس کے اٹھائے ہوئے سوالوں کا جواب دینے میں میری مدد کرے۔

☆......☆......☆

میری جنت کا دروازہ

کردار ساز، انسانی رویے وہ روشن دیے ہوتے ہیں جن سے ہمیں اپنی زندگی کے اندھیروں میں راہ سجھائی دیتی ہے۔ مثبت انسانی رویوں کے تذکرے سے ہی وہ گلدستہ تیار ہوتا ہے (خطا اور نسیان کو ہٹا کر) جس کی خوشبو انسانیت کی مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔ اسی گلدستے کا ایک پھول میرے والد مرحوم بھی ہیں۔

مرے والد جن کو خاندان کے اکثر بچے ''ابی جاں'' کہہ کر بلاتے تھے ان کی زندگی کے کئی پہلو اس معاشرے میں خاندانی رویوں کے حوالے سے مثال ہیں۔

میرے والد عبدالغنی احسن، ایک مستحکم و مضبوط عقیدہ و نظریہ کے حامل مسلمان تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اس کی رضا پر پہلو سے مقدم رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اظہار ہر وقت کرتے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تذکرہ کرتے۔ توحید کے علمبردار تھے دکان پہ دیہاتی لوگوں سے خصوصاً اس موضوع پر بات کرتے۔ شرک یا اس سے قریب عمل کی کوئی بھی کیسی ملاوٹ نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر مکمل بھروسہ ان کی زندگی کو ہر قسم کے حالات میں ثابت قدم رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا پہ راضی رہنے کا خیال کبھی متزلزل نہ ہوا۔

ہمارے بزرگ حکیم محمد عبداللہؒ چودھری نذیر احمدؒ کے ساتھ ملکر نے اپنے آبائی گاؤں روڑی کے قریب شہر سرسہ کے نواح میں ''دارالسلام'' آباد کیا تھا اس بستی (دارالسلام) کا مقصد ایک نمونے کا شہر آباد کرنا تھا جہاں مدرسہ، مسجد، تربیت گاہ، مطالعہ گاہ کے علاوہ نوجوانوں کو ہنر بھی سکھائے جاتے تھے۔ میرے والد ان نوجوانوں میں شامل تھے جو اس بستی کو آباد کرنے کے پرجوش کارکن تھے۔ مرزا مسرت بیگؒ، ڈاکٹر مقبول احمد شاہد (والد صائمہ اسماء)، ہدایت اللہ سلمانی (قانتہ رابعہ کے والد)، حکیم عبدالحمید سلمانی، ظہور احمد مجاہد اور میرے والد عبدالغنی احسن اس بستی کے معروف نوجوان تھے۔ ان سب نوجوانوں نے مل کر ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کی کتابت اشاعت، تربیت و تنظیم مضامین وغیرہ کا انتخاب اور پھر اس کی تقسیم خود ہی کرتے تھے۔ میرے والد کا ادبی ذوق عمدہ تھا۔ اس میگزین کے بارے میں ماموں جان ہدایت اللہ مرحوم بتایا کرتے تھے کہ ''اس رسالے کا نام زیر غور تھا اور عبدالغنی اپنا کوئی تخلص بھی رکھنا چاہ رہے تھے۔ ہم مل کر کہیں جا رہے تھے اور مختلف ناموں پر غور بھی کرتے جا رہے تھے۔ پھر یہ تجویز ہوا کہ راستے میں مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے جس مسجد میں رکیں گے، وہاں امام صاحب نے جس سورت کی تلاوت کی اس میں سے ہی کوئی لفظ چن لیں گے۔ جب ہم نماز پڑھنے سے فارغ ہوئے تو سب کا متفقہ فیصلہ ہوا کہ ''احسن'' نام رکھا جائے گا۔ کیونکہ امام صاحب نے سورہ التین کی تلاوت کی تھی۔''

تحریکی رسالے جتنے بھی شائع ہوتے تھے، سب پہلے پرچے سے لے کر مدتوں تک ہمارے ابی جان کے نام سے آتے رہے۔ مطالعہ کا شوق و ذوق اس قدر تھا کہ کتابوں کا انتخاب ان کا مشغلہ تھا۔ مستند سیرت و تاریخ کی کتابیں موجود رہیں۔ میرے بچپن میں درجن بھر سے زیادہ ماہانہ رسائل و جرائد بچوں، بڑوں کے ہمارے گھر آتے تھے۔ روزانہ اخبارات اس کے علاوہ تھے۔ مولانا مودودیؒ کی ہر کتاب ان کی لائبریری کی زینت تھی۔ میرے نام کا حصہ ''تسنیم'' اخبار پہ رکھا۔ پاکستان بننے کے بعد ہجرت کے سخت مراحل سے گزر کر جہانیاں میں رہائش پذیر ہوئے۔ کیونکہ ہمارے بزرگ مولانا حکیم عبداللہ مرحوم اور چودھری نذیر احمد مرحوم نے بہت سارے شہروں اور علاقوں کا جائزہ لینے کے بعد جہانیاں کو رہنے کے لئے مناسب مقام پایا۔

سفر و ہجرت کی صعوبتیں، نئی جگہ پر معاش کی پریشانیاں، وبائی امراض سے اموات کے صدمے، ایک چیلنج تھا ہر اک کے لئے نئے وطن میں آباد ہونا۔ دینی جذبے اور تحریکی شعور نے ہمارے والد کی زندگی کو کسی بھی مرحلے پر مایوسی سے ہمکنار نہ کیا۔ جب پاکستان میں پہلے الیکشن

ہوئے تو ابی جان دور دراز علاقوں میں الیکشن مہم پہ گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیوی زچگی کی تکلیف کے دوران اللہ تعالیٰ کو پیاری ہوگئی۔ اطلاع ملنے پر گھر آئے۔ صبر و رضا اور حوصلے کی رِدا اوڑھے جلد ہی اپنی مہم پر واپس چلے گئے۔ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا عزم ان کو اسی صورت میں پورا ہوتا نظر آتا تھا کہ باشعور مسلمان الیکشن کے ذریعے اسمبلیوں میں پہنچیں۔ پاکستان میں جب بھی الیکشن ہوئے ابی جان نے دامے، درمے، سخنے اس کو جہاد سمجھا اور ہر مرتبہ اس کے لئے مثالی سعی و جہد کی۔ پاکستان سے والہانہ محبت تھی۔ 65ء کی جنگ کے ہیرو ایم ایم عالم جہانیاں آئے تو ان کی خدمت کیلئے کمر بستہ رہے۔ سقوط ڈھاکہ پہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

مرے زمانہ طالبعلمی میں اجتماعات میں شریک ہونے کے لئے یا دوسرے شہروں میں ملاقاتوں اور دوروں کے لئے جانے پہ کبھی قدغن نہ لگائی۔ بچپن میں کوئی تحریر شائع ہوئی تو مجھے نقد انعام دیتے۔ میری والدہ نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا۔ لکھنے کی تربیت کی اور میرے والد نے میری حوصلہ افزائی کی، شاباشی دی۔ جماعت کے رہنما قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہوتے تھے تو میرے والد ان کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھتے تھے۔ کم گو تھے لیکن ایسے معاملے پر بھرپور اظہار خیال کرتے تھے۔ محلّہ کے نوجوانوں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی رہنمائی کرتے، محبت و شفقت کرتے تھے۔ رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر نذیر احمد شہید ہوئے تو کئی دن ملول رہے۔ دونوں میں دوستی اور بھائی چارہ تھا۔

ساری عمر مسجد کمیٹی کے ممبر رہے۔ صائب الرائے تھے۔ خاندان میں، گلی محلّہ میں یا کسی بھی پنچایت میں بلائے جاتے تو ٹھوس، جامع، مدلل اور قابل عمل رائے دیتے تھے۔ صلح جو تھے، دوسروں کے درمیان صلح کرواتے، تعلقات کو نبھانے اور درست رکھنے کی پوری کوشش کرتے۔ اپنی طرف سے رنجش کا اظہار نہ کرتے۔ تحمل، برداشت اور حلم ان کی خاص خوبیاں تھیں۔ سلیقہ مند، شائستہ اطوار اور منصوبہ بندی کر کے کام کے عادی تھے۔ ہڑ بونگ، بدزبانی الل ٹپ کام کرنے کو عیب جانتے تھے۔ مالی معاملات اور تجارتی لین دین میں ایمانداری، محنت اور ایفائے عہد پہ کاربند رہے۔ سنجیدگی، متانت، توازن ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔

نہ خوشی میں آپے سے باہر ہوئے نہ غم کی کٹھالیوں سے گزرتے ہوئے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے۔

بچوں کو خصوصاً بچیوں کے ساتھ چاہے وہ اپنی ہوں بھانجیاں، بھتیجیاں ہوں یا پاس پڑوس کی، سب کے ساتھ شفقت کا رویہ ہوتا۔ خاندان کی بچیاں خاص انس اور خصوصی الفت کا جذبہ اپنے دلوں میں محسوس کرتیں۔ حالانکہ نہ کبھی لمبی نشست ہوئی نہ زیادہ بات چیت کرتے۔ مگر محبت، پیار اور بزرگانہ شفقت کے چند بول، دعائیں اور سر بہ دست شفقت سب کو اپنے لئے خاص ہی محسوس ہوتا تھا۔ خاندان میں یا دوست احباب، پاس پڑوس کی بچیوں کو سسرال میں کوئی پریشانی یا تکلیف ہوتی تو عملی طور پر اس کا حل تلاش کرنے میں معاونت کرتے۔ سب ان پر بھروسہ کرتے ان کے مشورے پر صاد کرتے...... بہت لوگوں کو ان کی کم آمیزی اور مختصر گفتگو کا گلہ ہوتا تھا۔ ضرورت کے مطابق بات کرتے لیکن ٹھوس مضبوط دلائل کے ساتھ ان کی شخصیت کا خاصل پہلو تھا۔ کم کھانا، کم بولنا، اور کم سونا۔ ان کی زندگی میں افراتفری، غل غپاڑہ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لب و لہجہ دھیما، منتخب الفاظ یہ بات چیت کا انداز تھا تو چال میں شاہانہ وقار تھا۔ مجال ہے قدم غیر متوازن ہو۔ بہت سارے لوگوں میں دور سے پہچانے جاتے تھے اپنی متوازن اور پروقار چال کی وجہ سے۔

بگاڑ، باہمی تعلقات کا ہو یا گھر کی مادی اشیاء کا ان کی درستگی میں دیر نہ لگاتے۔ ٹوٹے رشتے، ناراض لوگوں کی آپس میں صلح کرانے میں پہل کرتے۔ غصہ اور ناگواری کا اظہار منہ سے نہ کرتے۔ پیشانی پہ ایک رگ ابھر آتی اور ہونٹ زور سے دبا لیتے گویا اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو پورے ضبط سے ٹھنڈا کر رہے ہیں اور منہ سے کوئی لفظ نہ نکلنے پائے۔

''پہلوان تو وہی ہے جو اپنے غصہ کو قابو میں رکھے۔''

انتخاب چاہے دوستوں کا ہو...... یا کپڑوں کے رنگوں اور کوالٹی کا یا برتنوں اور گھر کی دیگر اشیاء کا۔ بہترین انتخاب ہوتا۔ ہماری والدہ طبعاً درویش صفت اور سادگی پسند تھیں، ہمارے والد نے اپنے ذوق کے مطابق بہترین لباس اور اشیاء ان کے لئے مہیا کیں، ہمارے والد کی خریداری کو خاندان کی خواتین بھی سراہتی تھیں۔ مردوں کو اپنی بیویوں کی بے جا فرمائشوں اور بے جا خرچوں کا گلہ ہوتا ہے۔ میرے والد کو ہماری امی سے

سادگی و درویشی کا گلہ تھا۔ مردوں کے لئے کاروباری دنیا ایک کڑا امتحان ہوتی ہے۔ اور اگر شراکت پہ کاروبار ہوتو یہ آزمائش اور بھی بڑھ جاتی ہے ہمارے والد اور ہمارے ماموں حکیم ہدایت اللہ سلمانی نے باہم شراکت پہ کاروبار شروع کیا۔ ایک مدت تک کاروباری اداروں تک کو اندازہ نہ ہوا کہ ہم جن کے ساتھ معاملات طے کر رہے ہیں وہ آپس میں سگے بھائی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں پہ خاص کرم کیا تھا۔ دونوں کو اتنا وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف بنایا تھا کہ کسی کو ایک دوسرے سے شکایت نہ ہوئی۔ مدت تک پیار ومحبت اور اعتماد کے سائے تلے کاروبار کرتے رہے۔ ہمارے ماموں ہدایت اللہ مرحوم کو روحانیت سے خاص شغف تھا اور درویشی ان کی صفت تھی۔ دنیاداری سے ان کا اتنا ہی تعلق تھا کہ جسم و جان کا رشتہ قائم رہے۔ ہمارے والد نے ان کے حصہ کا کام بھی ایک وقت آیا کہ احسن طریقہ سے نبھایا اور ان کے سارے معاملات کو بحسن وخوبی چلایا۔

خونی، قانونی، کاروباری، تعلق ورشتے کے باوجود سب نے ایک دوسرے کی رفاقت اور رشتوں کا احترام برقرار رکھا۔ اپنے حقوق پر دوسروں کو ترجیح دی۔ ایک دوسرا پہلو جس کا تذکرہ میں خاص طور پر کرنا چاہتی ہوں۔ وہ ہمارے والد مرحوم کا وہ اخلاق ہے جس پر بہت کم مسلمان مرد پورا اترتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''تم میں سے وہ بہترین شخص ہے جو اپنے گھر والوں خصوصاً اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے۔'' مزید فرمایا کہ ''تمہارے اوپر تین مردوں کا احسان ہے۔ ایک باپ، ایک استاد، ایک وہ جس نے تمہیں بیٹی دی۔''

میرے والد مرحوم کی زندگی، کردار واخلاق کا یہ وہ پہلو ہے جو انشاء اللہ ان کے درجات کی بلندی میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔ معاشرے کے مروجہ غیر شرعی لین دین کو ناپسند کرتے چاہے شادی بیاہ کا معاملہ ہو یا دوستی کا۔ بہت کم حضرات ایسے ہوتے ہیں جو حقوق وفرائض کے دائرے میں عدل وتوازن اور ترجیحات کا تعین کر سکیں۔ خصوصاً بیوی کے اور اس کے خاندان، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا پیمانہ ڈانواں ڈول ہی رہتا ہے۔ اپنے گھر میں آنے والی خاتون کے رشتہ داروں کو اپنا سمجھنے کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ بلکہ اپنے گھر آنے والی کو بھی اپنے خاندان کا حصہ نہیں سمجھا جاتا اگر وہ اپنے خاندان کی نہ ہوتو معاملہ اور بھی دگرگوں ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں یہ عدم توازن بہت سی معاشرتی ونفسیاتی الجھنوں کا باعث بنتا ہے کہ بیوی سسرال میں آ کر تو سارے رشتے ناطے نبھائے اور اپنے میکے والوں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی حق دار نہ ہو۔

میرے والد مرحوم نے اپنے قانونی رشتہ داروں کا خیال اپنے رشتہ داروں جیسا ہی رکھا بلکہ زیادہ رکھا۔ آپس میں رشتہ داری بھی تھی لیکن اس کو زمانے کے مروجہ پیمانوں سے کبھی نہیں ناپا۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ ''تمہارے والد کا اماں جی (ہماری نانی اماں) سے اتنا پیار تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے زیادہ ان پر بھروسہ کرتی تھیں۔ ہمارے والد نے حقیقی ماں کی طرح ان سے محبت کی اور ان کی مشکلات و پریشانیوں میں تعاون کیا جبکہ ہجرت کے بعد دگرگوں حالات میں وہ کسی سے کوئی اظہار نہیں کرتیں تھیں صرف تمہارے والد ہی ان کے ہم راز و غمگسار تھے۔ بیوگی اور چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا اماں جی غیرت مند تھیں اپنی مشکلات کا اظہار نہ ہونے دیتی تھیں۔ مگر ہمارے والد سے محبت اور اعتماد تھا۔ اس لئے پہلی بیٹی کے فوت ہونے پر ان کو دوسری بیٹی دی۔''

ہماری والدہ مرحوم ہمیشہ والد مرحوم کے ایثار، جذبہ خلوص ومحبت اور تعاون کی تعریف کرتیں۔ ہماری والدہ نے گھر کے انتظامات کو ہمیشہ ترتیب وتنظیم سے چلایا، اپنے گھر کو اہمیت دی۔ لیکن جب کبھی دوسروں کی خاطر ایثار کا وقت آیا تو اس میں بھی کوتاہی نہ کی۔ میرے والد نے ہمیشہ ان کے اس جذبے کی حوصلہ افزائی کی۔ تعاون کیا، ہماری ممانی رشیدہ قطب (بیگم ڈاکٹر کفایت اللہ فیصل آباد) ہماری امی سے کہتی تھیں کہ ''آپا! بھائی صاحب بہت اچھے ہیں، بڑے دل کے مالک ہیں جو آپ اس طرح خدمت خلق کرتی ہیں۔ ورنہ مرد تو برداشت ہی نہیں کرتے کہ ان کی بیوی اپنے میکے والوں کے کام آئے۔''

والد مرحوم نے کبھی ہماری والدہ سے تند وتیز زبان ولہجہ میں بات کرنا تو کجا کبھی بلند آواز سے پکارا بھی نہیں۔ ہمارے چھوٹے ماموں کا گھر ساتھ ہی ہے درمیان میں دروازہ صحن کی دیوار بھی بہت بلند نہیں ہے۔ گویا کہ ایک ہی گھر ہے۔ ہماری ممانی اور ان کے بچے گواہ ہیں کہ

گزشتہ چالیس برسوں میں کبھی ہمارے والد کی آواز ان کے گھر تک پہنچی ہو۔ یا تلخ لب ولہجہ کا شائبہ ہوا ہو۔ گھر کے اندر بھی اتنا ہی وقار، ویسی ہی شائستگی، وہی نرمی و محبت، حلم وتحمل جیسی کہ گھر سے باہر۔ انسان کے حقیقی کردار وشخصیت کا اندازہ تو گھر میں ہی ہوتا ہے۔ الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا کہ ہمارے والد اس طرح کی دو رنگی سے محفوظ تھے۔ بیٹیوں سے خصوصی پیار، ہرنئی بیٹی کی پیدائش پر پہلے سے زیادہ محبت و شفقت کرنے والے۔ جب ہماری چھوٹی بہن پیدا ہوئی اور اطلاع ملنے پر ''الحمدللہ'' کہا تو اطلاع دینے والی عورت بے حد حیران ہوئی۔ وہ تو صدمے اور دکھ کے تاثرات کی منتظر تھی۔ پھر اس نے تبصرہ کیا کہ ''بیٹی کی پیدائش پر خوش ہوتے ہیں تو اللہ بھی ان کو خوش کر رہا ہے۔''

ہماری امی کو اکثر گلہ ہوتا کہ بچوں کے ساتھ زیادہ ہی نرمی برتتے ہیں۔ کسی بچے کو ڈانٹا جھڑ کا نہیں، مارنا تو دور کی بات ہے۔ ہمارے بڑے بھائی مرحوم شاہد کو کبھی نہ ڈانٹا بھائی کا بچپن عام بچوں کی طرح نہیں تھا۔ نہ شرارت، نہ کسی کو ایذا رسانی، خاموش طبع تھے اور بہت زیادہ مطابقت رکھتے تھے روحانی مزاج کے حوالے سے ہمارے ماموں ہدایت اللہ کے ساتھ...... جوانی میں ہی اپنی مہلت عمر پوری کر کے اپنے رب سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جوان بیٹے کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا، مشکل امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا پہ راضی رہنے والوں کا کڑا امتحان تھا...... وہ وقت آزمائش بھی پوری ایمانی کیفیت کے ساتھ گزارا۔ اللہ تعالیٰ ان کو صبر، حوصلے کا پورا پورا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

ہماری دادی جان اور دادا جان کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد ہمارے والد اپنے تین بہن بھائیوں کو اپنے ہاں لے آئے تھے۔ ان کی پرورش، تعلیم وتربیت کے فرائض ہماری والدہ مرحومہ نے اپنی پوری خلوص نیت اور سوز دروں سے ادا کئے۔ ہمارے والد مرحوم نے اس کا تذکرہ ہم سے اکثر کیا کہ ''یہ میرا فرض تھا، میری ذمہ داری تھی مگر تمہاری امی نے اس کو احسن طریقہ سے ادا کر کے مجھ پر احسان کیا ہے جس کا حق ادا کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔'' وفات سے ایک ماہ پہلے میرے گھر میں اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے گریہ طاری ہو گیا تھا ان پر رب ارحمھما کما رَبَّیٰنِی صَغِیْرًا حالانکہ میرے والد نے بھی اس سے پہلے ہماری نانی اماں اور ان کے چھوٹے بچوں کے بارے میں اپنا فریضہ ادا کیا ہی تھا۔ مگر اس بات کو کبھی نہ جتایا جبکہ ان کے احسان سے ہمیشہ ممنون رہے۔

ابی جان نے اپنی جائیداد بنائی تو ہماری امی جان کے لئے بھی ضرور خریدی اور کاروبار میں بھی ان کا حصہ شامل کیا۔ ہر معاملے میں شریک حیات رکھا...... مالی معاملات ہوں یا معاشرتی جب والد مرحوم کو حج کی سعادت نصیب ہوئی تو ان دنوں میرا قیام سعودی عرب میں ہی تھا۔ ہم نے کوشش کی کہ وہ اپنے گروپ کے ساتھ نہ رہیں اور ہمارے ساتھ حج کا فریضہ ادا کریں تاکہ آرام اور سہولت سے دن گزریں۔ مگر ان کی طبیعت اور مزاج نے گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے حج کے ساتھیوں کو چھوڑ کر ''آرام اور سہولت'' اختیار کریں، گردے کے عارضہ میں مدت سے مبتلا تھے۔ آخری دور میں عارضہ قلب میں بھی مبتلا تھے۔ تکلیف کی شدت اور پیرانہ سالی کے باوجود رمضان المبارک کے روزے قضا کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ بیماری یا موسم کی شدت بھی اس جذبہ کو ختم نہ کر سکی۔ تہجد کی نماز حتی الامکان ادا کرتے رہے اور مسجد کے ساتھ تعلق نمازوں کی ادائیگی کے علاوہ بھی برقرار رہا۔

قرآن پاک کی تلاوت روزانہ باآواز بلند کرتے۔ مجھے اپنے بچپن کی یادوں میں یہ منظر پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ ہے کہ ابی جان روزانہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر تلاوت کر رہے ہیں ان کی آواز سارے گھر میں پہنچ رہی ہے۔ ہماری والدہ باورچی خانہ میں ناشتہ بنا رہی ہیں اور ہم بچے اسکول جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ والد مرحوم ابی جان کی تلاوت کی آواز ابھی بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جو ہمارے گھر کے ماحول کا لازمی حصہ تھی۔ جمعتہ المبارک کو سورہ کہف کی تلاوت کرتے۔ کوئی بیماری کی وبا ہوتی تو سورۃ الناس کا ورد کرتے۔ اہلخانہ اور بچوں کیلئے۔'' قرآن پاک کے ساتھ میرے خصوصی تعلق کو بہت سراہتے تھے۔ میری والدہ ذکر کرتیں کہ جب تم بہت ہی چھوٹی تھی ابھی گود میں تھی۔ تو تم اپنے والد کی تلاوت کو غور سے سنتی تھی اور جس قدر بھی رو رہی ہوتی اس آواز کو سن کر خاموش ہو جاتی تھی اور ہمہ تن گوش ہو جاتی تھی۔'' گویا میرا اپنے والد سے تعلق قرآن پاک کی نسبت سے بھی

ہے اور آج جب میں اس قرآن پاک سے تلاوت کرتی ہوں جو چالیس سال میرے والد کے زیر تلاوت رہا تو مجھے ان سے تعلق وقرب کا احساس زندہ و جاوید لگتا ہے۔ اے اللہ! ہمیں اپنے والدین کے لئے صدقہ جاریہ بنا دے۔ آمین۔

ہمارے والد مرحوم رات کو گرمیوں میں گھر کی چھت پر سب بچوں سے نماز، چھوٹی سورتیں، گنتی، پہاڑے، چھوٹی چھوٹی نظمیں سنتے، کندھوں پر بٹھا کر جھولا دیتے۔ شہاب ثاقب، کہکشاں، چمکتے ستاروں اور روشن چاند کی باتیں کرتے۔ جس کو سبق اچھا یاد ہوتا اس کو نقد انعام دیتے۔ سردیوں میں مونگ پھلی، چلغوزے چھیل کر کھلاتے خاص حریرہ بنا کر کھلاتے جو خاص طور پر میوے ڈال کر بنتا۔ کھانا کھاتے تو گھر میں سب سے چھوٹے بچے کو ساتھ ضرور کھلاتے۔ ہماری والدہ کہتیں کہ ''خود کھانا کھالیں آرام سے'' ......مگر وہ اس بات سے خوش ہوتے کہ بچے کو ساتھ ساتھ لقمہ کھلایا جائے۔ ماموں جان کے بچے بھی آجاتے تو ان کو بھی توجہ سے کھلاتے۔ کھانا کھانے کے آداب سکھاتے۔ بچوں سے منی منی باتیں کرتے۔ کھانا کھاتے ہوئے انسان کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے بہت سے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ ہمارے والد اطمینان وسکون کے ساتھ، متوازن لقمہ منہ میں ڈالتے اور بغیر کوئی ناگوار آواز نکالے چباتے اور اسی طرح بچوں کی بھی تربیت کرتے کہ کھانا کھانے کا مسنون عمل اور درست طریقہ سے متوازن چال یہ دونوں باتیں انسان کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اپنے ہاتھ سے دوائی، کھانا کھلاتے پاس بیٹھ کر پیار بھرے بول سے دل جوئی کرتے۔ سر، بازو، ہاتھ سہلاتے تھے، آیات کا ورد کرتے، بھوک، نیند میں خلل، یا بے آرامی (بچوں کی وجہ سے) ان کو کبھی مشتعل نہ کرتی بلکہ کبھی ناگواری کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ چھٹیوں میں ہم ساری بہنیں اپنے بچوں سمیت آتیں تو بہت نہال ہوتے۔ شام کو دکان سے واپسی پر گھر آتے ہوئے کوئی نہ کوئی پھل یا مٹھائی ضرور ساتھ لاتے۔ یہ ان کا ہمیشہ معمول رہا۔ حالات حاضرہ کا پروگرام بی بی سی سے ضرور سنتے تھے۔

بیٹیوں کے سسرال سے ہمیشہ مخلصانہ محبت کا رویہ رکھا۔ چونکہ تحریکی بنیاد پر رشتے قائم کئے اس لئے من احب اللہ وابغض للہ کی سوچ کو مقدم رکھا۔

والدین اور بچوں کا روحانی تعلق دور بیٹھے بھی کس طرح قائم رہتا ہے اور کام کرتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ مجھے اکثر اس بات کا تجربہ ہوا۔ بغیر کوئی اظہار کئے والدین بچوں کو خصوصاً بیٹیوں کے دل کا حال لاشعوری طور پر محسوس کر لیتے ہیں۔ یہ دلوں کے معاملے ہیں۔

وفات سے چند ہفتے پہلے میرے پاس آئے۔ پاکستان میں معاشی تگ ودو میں ناکامی کے بعد خواجہ مجاہد شارجہ قسمت آزمائی کے لئے جا چکے تھے۔ میرے پاس جب ابی جان تھے تو انہوں نے مجھے ایک خاص وظیفہ بتایا جو میں نے ان کی ہدایت کے مطابق کیا۔ الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم فرمایا۔ خود بھی نماز کے بعد خصوصی دعا فرماتے رہے۔ انہی دنوں میں طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ بات کرتے کرتے بھول جاتے۔ مگر ایک بات جو میرے لئے باعث خوشی تھی کہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے کوئی بچہ غلطی کرتا تو اس کو درست کر دیتے تھے۔ کمزوری اور نقاہت بڑھ رہی تھی۔ عارضہ قلب نے نڈھال کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی رائے سن کر ہماری امی نے بہت کوشش کی کہ وہ جہانیاں چلنے پر رضامند ہو جائیں۔ مگر وہ میرے پاس میرے گھر رہنے کے خواہش مند تھے۔ امی جان نے گاڑی منگوائی۔ سامان سمیٹا، گاڑی میں رکھا، اپنا گاؤن پہنا اور ابی جان سے اٹھنے کو کہا مگر وہ ساری کارروائی خاموشی سے دیکھتے رہے۔ جب امی نے اصرار کیا تو لحاف منہ پہ لے کر لیٹ گئے اور بچوں کی سی معصومیت اور بے نیازی سے بولے۔

''تم جاؤ، میں نے نہیں جانا۔'' میری امی جان بھائی محسن کے ساتھ چلی گئیں کہ جہانیاں گھر میں کوئی نہ تھا جب ہماری امی چلی گئیں تو ابی جان ہنستے مسکراتے اٹھ بیٹھے۔ حمیرا شعیب کے بچے اور ہم سب مل کر اس بات سے بہت محظوظ ہوئے یہ میری سعادت تھی کہ میرے والد، میرے پاس میرے گھر رہنا باعث سکون سمجھتے تھے۔ میرے ساتھ خوش رہتے تھے۔ میرے ہاتھ سے کھانا کھا لیتے تھے۔ مجھے سراہتے کہ ''تمہیں مریض کو کھانا کھلانے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔''

سب بچوں نے نانا کو چھیڑا ''ابی جان آپ تو ایسے بہانے کر رہے تھے جیسے بچے سکول نہ جانے کے بہانے کرتے ہیں۔'' یہ سن کر خوب ہنسے۔

امی جان چلی تو گئیں وہاں جا کر بہت پریشان ہوگئیں کہ جلد از جلد گھر لانا چاہیے۔ اگلے دن بھائی بلال کو بھیجا۔ اسے دیکھ کر افسردہ ہو گئے میرے دوپٹے کا پلو پکڑ کر استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے بھائی بلال کو بھیجا۔ اسے دیکھ کر افسردہ ہو گئے۔ کہ مجھے لینے آیا ہے؟ اس کا اصرار کہ امی نے کہا ہے لازماً لے کر آنا ہے، مجھے ان کے دور رہنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے اور ابی جان میرے پہلو سے یوں لگ کر بیٹھ گئے جیسے بچہ ماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ جائے۔ امی کے فرمان کے مطابق پھر میں ابی جان کو لے کر جہانیاں روانہ ہوئی تاکہ وہ میری دوری سے افسردہ نہ ہوں۔ مغرب کے وقت پہنچے، نماز پڑھی۔ میں نے کہا دعا کر لیں تو بولے، تم کراؤ میں تمہارے پیچھے دہرا لوں گا۔ میں نے ہر ممکن طویل دعا کروائی۔ سب بچوں کا نام لے کر، سب ممکنہ دعائیں کروالیں۔ ساتھ ساتھ دہراتے رہے۔

یہ ہماری والد کی آخری لمبی گفتگو تھی وہ بھی الحمدللہ دعا کی صورت میں صبح تک نقاہت اتنی بڑھی کہ بولنے کی سکت نہ رہی۔ میرے شارجہ جانے کی تیاریوں سے بہت افسردہ ہوتے تھے۔ کہتے ''میری تو شام ہے تو صبح نہیں معلوم۔ صبح ہے تو شام کا علم نہیں۔ تم چلی جاؤ گی تو......'' میرے دل کی حالت زخمی پرندے جیسی ہو جاتی...... دل سے دعا نکلتی اللہ تعالیٰ صحت و عافیت سے رکھے آمین۔ میں چلی گئی اور اسی شام بعد نماز مغرب نشست و برخاست اور ہر کروٹ اور پہلو بدلنے پر اللہ اکبر کہنے والی زبان نقاہت کی وجہ سے خاموش ہوگئی۔ ابی جان کی زبان ''اللہ اکبر'' کے نعرہ عاشقانہ سے تر رہتی تھی۔ بچے جب گھر، گھروندہ بنا کر کھیلتے ہیں تو سارے کردار وہی اپناتے ہیں جو اپنے اردگرد دیکھتے اور متاثر ہوتے ہیں اسی سے بچوں کی تربیت کا رخ متعین ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں جب بچے گھر کے افراد کا بہروپ بھرتے تو ''ابی جان'' بننے والا بچہ ہر حرکت پر ''اللہ اکبر'' کہتا رہتا۔ اسی ذات کبریا سے سچی امید ہے کہ اپنے بندے کے ہر فکر و ذکر اور عمل کو بلند درجات عطا فرما دے گا آمین۔

ابی جان کے ساتھ میری طویل گفتگو اسی دعا کی صورت میں ہوئی جو میں نے ملتان سے جہانیاں آ کر بعد نماز مغرب ان کے ساتھ مل کر رب کے حضور پیش کی۔ 26 جنوری 2004ء کی سرد، اداس، سہہ پہر مجھے نہیں بھولتی جب میں نے اپنے عظیم باپ کا دست شفقت اپنے سر پر رکھا محسوس کیا۔ ان کی الوداعی خاموش، گہری آنکھوں میں ٹمٹماتی لو کا دھیما پن، محبت و شفقت کی گرمی کو کم نہ کر سکا تھا۔ ایک ان جانا سا خوف اور عجب بے کلی میرے وجود میں سرایت کر گئی۔ خاموش نگاہیں تعاقب میں تھیں۔ ان کے بستر سے دروازے تک چند قدم کا فاصلہ تھا جو مجھے اتنا کٹھن اور طویل محسوس ہوا کہ میں بے جان سی ہو گئی۔ کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ محسن زاہد کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے خالی خالی نگاہوں سے مجھے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ درد کی ایک لہر اور غم کی بے پناہ شدت سے میرا سانس گلے میں اٹک گیا۔ میں نے امی سے کہا ''میں نہیں جاؤں گی ملتان اس طرح کی پریشان کن حالت میں۔''

میری ماں نے ہمیشہ کی طرح اپنا فرض نبھایا اور تادیبی لہجہ میں کہا ''مجاہد بیٹا شارجہ سے کل ہی تو آ رہا ہے تم جاؤ، اس کے ساتھ آ جانا۔'' اندیشہ ہائے دور دراز اور سود و زیاں کی الجھی ڈور کا سرا تلاش کرتی دکھی دل اور اپنے اندر مسلسل برستی بارش کے ساتھ میں ملتان آ گئی۔ یکم فروری 9 ذی الحجہ کو جب حاجی عرفات کے میدان میں رب کے حضور حاضر تھے، میرے والد بھی دو سفید چادروں میں ملبوس اپنے رب کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ ابی جان کی خاموش نگاہوں کا تعاقب، ان کے اور میرے درمیان اس فانی دنیا کا آخری نقش ثابت ہوا۔ یہی آخری نقش وہ شاخِ نہالِ غم ہے جو ہمیشہ تر و تازہ رہے گی تا آنکہ میں اپنے ابی جان سے جا ملوں، اللہ رب العزت ہم سب بہن بھائیوں کو والدین کے ساتھ ان سرسبز شاداب باغوں میں رکھے جہاں ندیاں بہتی ہیں جن کا سایہ لازوال اور نعمتیں سدا بہار ہیں۔ آمین۔

☆......☆......☆

میری امی جان

اگر ایک نیک ،دیندار ماں اعلیٰ تعلیم یافتہ ماں بھی ہوتو میری آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کی تصویر ابھر آتی ہے جو سراسر صبر و رضا، پیکرِ شرم و حیا، علم وعمل کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ ساری عمر خدمت گذار بیٹی ، وفا شعار بیوی، مثالی ماں، آئیڈیل ساس اور شفیق دادی جان کی حیثیتوں کے علاوہ اقامت دین، حکومت الہیہ ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مشن میں خالصتاً رضائے الٰہی کی خاطر اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خرچ کرنے والی زیب آپا...... پیاری امی جان ......جن کی زندگی اس آیت کریمہ کے گرد گھومتی ہے:

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے''

امی جان نے نہ صرف اپنی پوری زندگی، جسم و روح پر حقیقی اسلام نافذ کر دیا بلکہ اپنی اولاد، اپنی رعیت کو بھی اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی حتی المقدور سعی کی۔ انہوں نے ساری زندگی اقامت دین کے مشن کیلئے صرف کر دی۔ خواہ گوجرانوالہ ہوں، خواہ قصور رہائش پذیر ہوں، خواہ لاہور کے کسی علاقے سمن آباد، اقبال ٹاؤن، مصطفیٰ ٹاؤن، مسلم ٹاؤن، پاک عرب میں ہوں ، ہر جگہ خواتین کو دروس قرآن وحدیث میں بلانا انکی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ کسی شادی، غمی، عیادت اور جنازے وغیرہ میں جاتیں ، ہر جگہ موقع پا کر خواتین کو زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کرتیں۔ جماعت اسلامی کی رکن کی حیثیت سے پشاور، اسلام آباد، قرطبہ سٹی ، مانگامنڈی، مینار پاکستان کے سالانہ اجتماع عام میں شرکت کی، جب تک جسم میں طاقت رہی، حلقہ خواتین کے ہر عوامی مظاہرے، سیاسی جلسوں میں بھی شریک ہوتی رہیں، سمن آباد زون، اقبال ٹاؤن زون، کاہنہ زون کے علاوہ متعدد دیگر زونوں کی ذمہ داریاں رہیں، جہاں کوئی رکن نہیں ہوتا، وہاں ان کی ذمہ داری لگا کر ایک گاڑی مل جاتی، اور یہ انتہائی دلسوزی ولگن سے وہاں تنظیم سازی اور توسیع دعوت کا کام کرتیں، بے شمار خواتین کو جماعت اسلامی کی دعوت، پیغام، مقصد سے آگاہ کر کے انہیں جماعت میں شامل ہو کر دین کیلئے کام کرنے پر آمادہ کرتیں۔ حافظ سلمان بٹ، میاں عثمان سے لیکر قاضی حسین احمدؒ تک کی گھریلو خواتین انکی دعوت اور کام سے آگاہ ہیں۔ ضلعی رہنماؤں نے ہسپتال آکر ان کی عیادت کی۔ انہوں نے اللہ کی رضا کیلئے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کی۔ یہ ابتداء ہی سے انکے خون میں شامل تھا، اور ان کے والدین کی بہترین تربیت کے سبب تھا۔ انکی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا......اللہ تعالیٰ کے دین کی سر بلندی وسرفرازی...... دین کی خدمت کے ساتھ ساتھ وہ گھر کے محاذ کو نہیں بھولی تھیں۔ انہوں نے تینوں بچوں کو حفظ قرآن کروانے کیلئے راسخ العقیدہ قاری صاحب گھر پر لگوائے۔ انہوں نے تینوں بچوں کو شروع ہی سے نماز کی عادت ڈالی۔ امی محترمہ کبھی کسی بچے کے منہ سے گالی برداشت نہیں کرتی تھیں کسی بچے کے منہ سے گالی سنتے ہی اسے قطع کلامی کی ''دھمکی'' دے دیتی تھیں۔ ہمیشہ غضِ بصر کی تلقین کرتیں۔ بچے نماز پڑھنے مسجد جاتے تو انہیں کر کنگھی کر کے صاف ستھرے کپڑے زیب تن کر کے مسجد جانے کی تلقین کرتیں۔

اب میری امی المعروف زیب آپا 10 پوتے پوتیوں کی شفیق دادی جان بن چکی تھیں۔ پوتوں پوتیوں کی ہر لحظہ نیک تربیت ان کے پیش نظر ہوتی۔ حتیٰ کہ جو بچہ سیڑھی بھی اترتا یا چڑھتا، تو ناراضگی و پیار کی آمیزش سے سبحان اللہ اور اللہ اکبر پڑھنے کی تاکید کرتیں۔ محترمہ امی جان کو قرآن پاک کی تلاوت کے دوران باتیں کرنے یا کسی بھی قسم کا دوسرا کام کرنے سے شدید کوفت ہوتی تھی، وہ اپنے بیٹوں کو سختی سے ایسا کرنے سے منع کرتیں۔

جب ہمارے والد اسد اللہ غالب پہلی دفعہ سبز کوٹھی والے گھر میں

جہازی سائز کا بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی لائے تو دوسرے کمرے میں بیٹھ کر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہیں۔ٹریجڈی ڈراموں میں خواتین کی عائلی زندگی کے واقعات دیکھ کرآبدیدہ ہوجاتیں تو ابوجان ہم بچوں کے ساتھ چپکے چپکے دروازے سے جھانک کرانکو ہنسا کرزندگی کی تلخیاں بھلانے کی کوشش کرتے۔امی جان سائنسی ایجادات کی مخالف نہیں تھیں مگر میڈیا کے منفی اثرات سے اپنے بچوں کو بچانے کیلئے انتہائی فکرمند تھیں۔

بچوں کی مستقل دینی تربیت اور منفی معاشرتی اثرات وغلط ماحول سے بچانے کیلئے اپنے دونوں بڑے بچوں کو انگلی سے پکڑ کر وقارحیدر، ناظم سمن آباد اسلامی جمعیت طلبہ کے حوالے کردیا،تیسرا بچہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔آج میں بڑا ہوچکا ہوں، بچوں والا ہوں، مگر ہماری تربیت کی امی جان کو اتنی فکر رہتی کہ ٹریفک کے رش میں گاڑی چلاتے ہوئے ہمیشہ ہمیں ''سورۃ الم نشرح'' پڑھنے کی تلقین کرتیں۔اور پھر میں نے اپنی آنکھوں سے یہ ''معجزہ'' ہوتے دیکھا کہ ٹریفک کے درمیان سے خودبخو درستہ نکلتا جاتا۔

انہوں نے تینوں بچوں کو قناعت،توکل،رب پہ رضا کی مثالی ٹریننگ دی۔بچوں کورواداری واعتدال پسندی کی تربیت دیکر N-235 سمن آباد میں متصل بریلوی مسجد میں بچوں کو پانچ وقت نماز کیلئے جانے کی تلقین کرتیں،نماز کے وقت تمام کام چھوڑ دینے،اذان کا جواب دینے کی عادتیں پختہ کرتیں۔اسلامیہ پارک میں ساتھ جاتیں۔ہر جمعہ کو خصوصی چکن بریانی یا پلاؤ پکا کر جمعہ کوعید کے طور پر منانے کا تصور ہمارے ذہنوں میں اجاگر کرتیں۔تاکہ مذہبی ہم آہنگی ورواداری کیساتھ ساتھ خالص عقیدہ توحید وسنت بھی ہمارے کردار میں راسخ ہو۔ہم تینوں بھائیوں کو اکیلے نماز کیلئے یا ناشتہ وغیرہ لینے کیلئے بھیجتی،اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے اندر کافی حد تک خوداعتمادی ہے۔............!!!

پیاری امی جان کی زندگی کے کس کس گوشے پر قلم اٹھاؤں، خیالات کا طوفان ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے۔لگتا ہے ایک پوری کتاب رقم ہوجائیگی......!صبح سویرے انکے ساتھ واک کرتے ہوئے کوئی آدمی پاس سے گذرتا تو ہمیں کہتیں:سلام کیوں نہیں کیا، ہمیں ہمیشہ ''افشوالسلام......'' کا درس دیا۔اسکے علاوہ گھریلو جھگڑوں میں ہم سب گھروالوں کو''جو خاموش رہا، وہ نجات پا گیا'' کی حدیث مبارکہ یاد دلاتیں۔آج وہ خود ساری زندگی صبر وخاموشی کیساتھ گذارنے کے بعد ہمیشہ کیلئے نجات پا چکی ہیں،غموں سے،صدموں سے، جھگڑوں سے اور اخروی کامیابی سے ہمکنار ہوچکی ہیں۔وہ''اللہ تعالیٰ نے مجھے 9 باتوں کا حکم دیا ہے'' والی حدیث پر نہ صرف خود شدومد سے عمل پیرا تھیں، بلکہ خاندان اور باہر ہر ملنے والے کواسکی یاددہانی کرواتی رہتی تھیں۔بالخصوص جومجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں...... پر بہت عمل کرتی تھیں۔

اپنا کفن،غسل کا تمام سامان وبندوبست خود تیار کرکے گئی تھیں۔لین دین کی تمام تر وصیتیں اپنی بہوؤں کو کرکے گئی تھیں جن پر انکی جانثار بہوؤں نے من وعن عمل کیا۔اللہ جزادے۔آپکی والدہ شریفہ بیگم بے انتہا نیک،شفیق اور سادہ دل تھیں ان کی رقت آمیز طویل نماز جنازہ میرے نانا جان نے خود پڑھائی۔ہمارے نانا جان یعنی امی جان کے والد محترم چودھری غلام حسین تہاڑیہ آف تلونڈی،بی اے ماشاء اللہ حیات ہیں، ۔ہم تینوں بچے برسرِروزگار ہیں،سب سے چھوٹا بیٹا روزنامہ دنیا کا کالم نویس عمار چودھری کے نام سے معروف ہے۔اسی ماں سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔میں ایم اے صحافت کرنے کے بعد اخبارات میں 15 سال سب ایڈیٹری کرنے کے بعد نادرا میں اسسٹنٹ منیجر (میڈیا) کی نوکری کرکے اپنے 5 بچوں کا پیٹ پال رہا ہوں۔یہ بھی میری ماں کی ہمت اور stand تھا کہ ایم اے صحافت بہاولپور سے کرنے کے بعد مجھے ابوجان نے خبریں میں ضیاشاہد کے پاس بطورسب ایڈیٹر ملازمت کی اجازت دیدی۔جبکہ دوسال میں نے ابوجان کے ساتھ کمپوزنگ وپبلشنگ کا کام کیا اور ابو نے لاکھوں کمائے اور خرچ کئے۔درمیان والا بیٹا نعیم الاسلام جمعیت کے بعد جماعت الدعوۃ کی ویب سائٹ اور آئی ٹی کا انچارج بن کر دین ودنیا کی بھلائیاں کمارہا ہے اور اپنی ماں کیلئے صدقہ جاریہ بن رہا ہے۔

ہماری پیاری امی جان ڈاکٹرز ہسپتال کے ہارٹ آئی سی یو میں ڈاکٹر خالد حمید کے زیرعلاج رہیں۔ڈاکٹرز ہسپتال میں بائی پاس آپریشن

کے بعد نرسوں کو ہمارا یعنی اپنے بیٹوں کا تعارف کرواتے ہوئے بتاتی ہیں کہ میرا ایک اور بیٹا بھی ہے جو مسجد میں بیٹھا میرے لئے ہر وقت دعائیں کرتا رہتا ہے...... یہ چیز انکی اس خوبی کی بھی غمازی کرتی ہے کہ انہوں نے ساری زندگی ہمیشہ خوش گمانی کی، بدگمانی، غیبت، چغلی سے پرہیز کیا۔

ہماری پیاری امی جان......زیب آپا......سراپا صبر و رضا، جود وسخا، پیکرِ علم وعمل ہیں۔ آج وہ لاہور کے ایک مہنگے ہسپتال ڈاکٹرز ہسپتال کے ہارٹ آئی سی یو میں ڈاکٹر خالد حمید کے نشتر کے زخموں کو مندمل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں، ان کی زندگی اسلامی انقلاب کیلئے سرتاسر ہمہ وقتی کٹھن جدوجہد پر مبنی ہے۔ آج ڈاکٹر خالد حمید نے محض ان کا دل نہیں کھولا، بلکہ بے بہا صدموں، چرکوں، سانحات کے خزینے پر ہاتھ ڈالا ہے جو وہ ساری زندگی خاموشی سے اندر ہی اندر صبر و رضا کے ساتھ ہونٹ بند کر کے سہتی رہی ہیں۔ نماز روزے، تہجد کی سختی سے پابند زندگی گذاری، آپریشن کے 29 دنوں کی نمازیں فوت ہونے پر اپنے بچوں کو ہر نماز کے ساتھ ایک نماز کی قضا ادائیگی کی تلقین کرتی رہیں۔ اپنے مجازی خدا، کے تلخ وشیریں اتار چڑھاؤ میں ہر طرح انکا ساتھ دیا اور کبھی حرفِ شکائت لب پر نہ لائیں۔

سمن آباد میں مسز فرحت ابراہیم، مسز ثریا سعید، مسز مقبول شاہد، مسز رانا نذر الرحمٰن و دیگر انکی بھر پور تنظیمی، دینی، دعوتی زندگی کی دیرینہ رفقاء کار رہی ہیں۔

انکا بائی پاس درحقیقت ان گنت تلخ تجربوں اور سانحات کا پنڈورا باکس کھولنے کے مترادف تھا، انکے پھیپھڑوں میں بھرا پانی درحقیقت انکے آنسوؤں کا وہ بند سیلاب تھا جو انہوں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز، آزمائشوں، تلخیوں کی صورت میں سنبھال کر رکھے تھے، ان کی 72 سالہ صبر آزما، جانگسل، جدوجہد سے پُر زندگی میں متعدد سانحات، صدمے انکو پیش آئے، جن میں بچپن میں ان کے 2 بہن بھائیوں کی وفات کا صدمہ، انکی والدہ کی وفات، بیٹے نعیم کی ذہنی وجذباتی صورتحال، عائلی زندگی کی تلخیاں، سرفہرست ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے مجازی خدا کی کبھی برائی نہیں کی، اپنے بچوں کے سامنے، نہ زمانے کے سامنے۔ صرف مجازی خدا کی اچھائیوں پر نظر رکھی، انکی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں انکا حوصلہ بڑھایا، ساتھ دیا، بچوں کو باپ کی خدمت واحترام کی تلقین کی۔ والد گرامی اگر دنیا کی نظروں میں ایک عظیم آدمی ہیں، تو والدہ محترمہ اللہ کی نظروں میں عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے بچوں کی دینی، تعلیمی، اخلاقی حالت سنوارنے پر توجہ دی اور انہیں بگڑنے نہ دیا۔ آج انکی خوشحال، پرمسرت زندگی اس امر کی گواہ ہے۔

مگر سورۃ الفجر کی آخری آیات پر نظر ڈالتا ہوں، تلاوت کرتا ہوں تو دل کو گونا گوں تسلی ہوتی ہے کہ اب ان کے پر آزمائش، پر تکلیف طویل صبر آزما دور کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

اب وہ اپنی اصلی منزلِ مراد، محبوب ومقصود حقیقی کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ بلاشبہ ریا کاری، شرک، تکبر سے پاک، خالصتاً رضائے الٰہی کیلئے اپنے آپ کو فنا فی الاسلام کر دینے والی عظیم ہستی اپنے صبر و رضا کا پھل پا چکی ہیں۔ انکے سانحہ ارتحال کے بعد انکے عزیز شوہر سمیت پوری فیملی ٹوٹ پھوٹ کا شکار اور شدید صدمے سے دوچار ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ان جیسا مثالی صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ان کے جنازے میں ایک ہزار سے زائد لوگ شریک ہوئے۔ اور حافظ محمد سعید، امیر جماعت الدعوۃ پاکستان نے انتہائی رقت آمیز انداز میں باآواز بلند مغفرت کی دعائیں نماز جنازہ میں پڑھیں تو آہوں وسسکیوں سے فضا گونج اٹھی۔ انکے جنازہ میں امیر جماعت اسلامی لاہور میاں مقصود احمد، فاروق ناطق، محمد یونس میو و دیگر تحریکی افراد شریک ہوئے حلقہ خواتین کی مرکزی رہنما ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی، آپا جی زہرہ وحید و دیگر بھی ان کے سفرِ آخرت پر موجود تھیں۔ ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی نے دعا کروائی اور مختصر درس قرآن دیا، مرحومہ ومغفورہ کی دیرینہ خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

ع آسماں تری لحد پہ شبنم فشانی کرے

☆......☆......☆

طوبیٰ احسن

ایک ادبی نشست

لکھنا ایک تخلیقی عمل ہے۔ تاہم تحریر کو نکھارنے کیلئے اصلاح و تنقید کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نو آموز لکھاریوں کی رہنمائی کیلئے حریمِ ادب کی نشستیں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہاں مثبت تنقید کے ذریعے تحریر کی اصلاح کی جاتی ہے۔ کُہنہ مشق قلم کاروں اور ممتاز افسانہ نگاروں کے تجربات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مختلف موضوعات پر تحریری مقابلہ بھی کرایا جاتا ہے جس سے لکھنے والوں کے ذوق وشوق کی آبیاری ہوتی ہے۔

ایسی ہی ایک نشست کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کا انعقاد نئے سال کی آمد کے ساتھ ہوا۔ نئے سال کا آغاز گویا نئی سوچ، نئے عزم اور نئے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز ہے۔ اس ادبی نشست میں ستمبر میں ہونے والے تحریری مقابلے ''میں نے سوچا'' کے نتائج کا اعلان کیا جانا تھا۔ نشست کے لئے جمعہ 2 جنوری کا دن منتخب کیا گیا۔ کراچی کے مخصوص حالات کے پیش نظر کبھی کبھی سوچ کی ایک لہر اٹھتی اور دل کو مضطرب اور بے چین کر دیتی کہ کوئی ایسی وجہ نہ ہو جائے کہ خدانخواستہ پروگرام کو ملتوی کرنا پڑے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مقابلے میں ہم نے بھی حصہ لیا تھا اور نتائج کا بے چینی اور بے قراری سے انتظار تھا۔ ساتھ خدا سے دعا گو تھے کہ اس ادبی نشست کا انعقاد آسان ہو، تمام شرکا کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکے، پروگرام کامیاب ہو (اور انعام یافتہ میں ہمارا نام ہو تو کیا کہنے!) خدا کی مدد سے ادبی نشست کا آغاز اپنے مقررہ دن پر بروقت چار بجے ہوا۔ اس خوبصورت، رنگ برنگی، جھلملاتی ادبی نشست کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، اناؤنسمنٹ کے فرائض فری نعیم انجام دے رہی تھیں۔ مہمانانِ گرامی میں محترمہ فرحت طاہر (حریم ادب پاکستان کی صدر) محترمہ غزالہ عزیز (افسانہ نگار، کالم نگار) محترمہ عقیلہ اظہر (افسانہ نگار، حریم ادب کراچی کی صدر) اور محترمہ حلیمہ عثمان شامل تھیں ان کے ساتھ ساتھ کراچی کے مشہور ماہناموں خواتین ڈائجسٹ اور شعاع کی ایڈیٹر محترمہ امت الصبور کی شرکت نے پروگرام میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ محفل کی رونق ان ہی خواتین کی مرہون منت تھی جن کی صلاحیتوں اور تجربات سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع ملا۔

محترمہ غزالہ عزیز اچھے افسانے کی خصوصیات سے آگاہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے نئے قلم کاروں پر زور دیا کہ بچوں کے ادب پر بھی توجہ دیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مطالعے اور مشاہدے کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔ امت الصبور صاحبہ نے کردار نگاری کی اہمیت پر بے حد زور دیا ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ افسانہ یا کہانی میں سبق موجود ہو لیکن چھپا ہوا ہو۔

محترمہ عقیلہ اظہر نے قلم کاروں کو اپنے تجربات سے مستفید کرتے ہوئے مختصراً بتایا کہ آپ قارئین تک جو بھی پیغام پہنچانا چاہتے ہیں وہ ایسا ہو کہ پڑھنے والے واقعات سے خود اخذ کریں۔

محترمہ عشرت لطافت، محترمہ نسیم آرا اور ڈاکٹر عزیزہ انجم نے اپنی خوبصورت شاعری پیش کی۔

محترمہ فرحت طاہر نے محفل کو کامیاب بنانے پر مہمانانِ گرامی اور شرکا کو بے حد سراہا اور رواں سال کیلئے حریم ادب کے پروگرام سے آگاہ کیا۔

محترمہ حلیمہ عثمان نے جن کا تعلق سوشل میڈیا سے ہے۔ حاضرین محفل کو بتایا کہ سوشل میڈیا پر قلم کارواں کے نام سے ایک ادبی گوشہ موجود ہے۔ جہاں پر آپ اپنی تحریروں کو شیئر کر سکتے ہیں۔ ایڈریس یہ ہے۔

اب ہم نے دل تھام لیے تھے کہ وہ وقت آ پہنچا تھا جب نتائج کا اعلان کیا جانا تھا۔ پہلا انعام طوبیٰ احسن (راقمہ) دوسرا منیرہ عادل اور تیسرا تنویر صدیقی کو دیا گیا۔ 2014 میں ویمن رائٹرز فورم کے تحت ہونے والے مقابلے میں انعام حاصل کرنے والی دو قلم کاروں فرحی نعیم اور حمیرا خالد کو خصوصی انعامات دیئے گئے۔ جن خواتین نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا ان تمام کو ہی حوصلہ افزائی کیلئے تحائف پیش کئے گئے۔ اسی محفل میں اگلے مقابلے کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے۔

عنوان ہے ''میں بھول نہیں سکتی۔''

آخر میں چائے کا انتظام تھا۔ یوں یہ خوبصورت، پروقار ادبی نشست اختتام کو پہنچی۔

حریم ادب کا یہ قافلہ رواں دواں ہے۔ پھر کیوں نہ آپ بھی اگر مطالعہ کا شوق اور لکھنے سے دلچسپی رکھتی ہیں تو اپنے اردگرد ہونے والی حریم ادب کی محفلوں کو ڈھونڈ کر ان میں شرکت کریں، اپنے شوق کی آبیاری بھی کریں اور معاشرے کو بہتر بنانے میں اپنا حصہ بھی ڈالیں۔

☆......☆......☆

خاص ہے ترکیب میں............

''عفیفہ آپ میرے آفس میں آئیں۔''

مس ایمان نے کلاس کے اختتام پر میز سے رجسٹر اور کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ رجسٹر اور کتابیں ریک میں رکھ کر وہ پانی پینے لگیں کہ عفیفہ نگاہیں جھکائے السلام علیکم کہتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''یہاں بیٹھئے بیٹا!'' انہوں نے قریبی کرسی کی طرف اشارہ کیا، پرس سے چند ٹافیاں نکالیں اور پلیٹ میں رکھ کر عفیفہ کی طرف بڑھائیں کہ اس وقت میزبانی کے لئے ان کے پاس یہی کچھ تھا۔ عفیفہ متحیر سی مس کی عنایات ملاحظہ کر رہی تھی کہ وہ گویا ہوئیں۔

''بیٹا آپ کے گھر میں سب خیریت تو ہے نا؟ آپ نے معمول سے ہٹ کر کل چھٹی بھی کی! اور آج آپ کی آنکھیں آپ کا چہرہ شکوہ کناں ہے کہیے کیا مسئلہ ہے جس نے آپ کو الجھا رکھا ہے اور آپ کی یکسوئی کو متاثر کیا ہے'' ......نرم سوالیہ لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ دو دن سے رکے آنسو بہہ نکلے۔ مس نے اسے رونے دیا۔ جب قدرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

''مس میرے والد KESC میں ملازم ہیں۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں ابو کی تنخواہ سے بمشکل دو وقت دال روٹی چل جاتی ہے۔ تعلیم کے اخراجات ہم بہن بھائی ٹیوشن پڑھا کر پورا کرتے ہیں۔ گھر میں بے حد سکون و اطمینان ہے۔ میری دوستیں بھی میرے گھر آ کر سکینت کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ ایسے میں میری امی کہتی ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے والد کی حلال کی کمائی کی بدولت ہے کہ انہوں نے کبھی لقمہ حرام کو گھر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ مگر جب سے میری بہن کالج جانا شروع ہوئی ہے نہ جانے کیسی صحبت ملی ہے کہ عجیب بہکی بہکی ناشکری کی باتیں کرنے لگی ہے۔ کہتی ہے۔ ہمارا گھر بھی کوئی گھر ہے نہ اچھا کھانا نہ پہننا اوڑھنا نہ گاڑی ہے نہ بنگلہ، میری دوستوں کے ایسے گھر ہیں کہ بس دیکھتے رہ جاؤ۔ نت نئے بوتیکس کے کپڑے زیب تن کرتی ہیں۔ اکثر ویک اینڈ پر سیر و تفریح کے لئے جاتی ہیں میکڈونلڈز میں پارٹیاں کرتی ہیں۔ لشکارے مارتی چمکتی گاڑیوں میں آتی ہیں موبائل، لیپ ٹاپ تو ہر ایک کے پاس ذاتی ہیں۔ انٹرنیٹ کی باتیں کرتی ہیں تو شرمندگی ہونے لگتی ہے کہ میری زندگی بھی کوئی زندگی ہے، گھر تو جیسے ایک ڈبہ ہے۔ کل اس نے ابو سے لیپ ٹاپ کی فرمائش کی۔ ابو نے کہا بیٹا سب آپ کے سامنے ہے۔ میرے پاس اتنے ہی پیسے ہوتے ہیں کہ جن سے تمہاری ماں مہینہ بھر گھر چلاتی ہے۔ اس پر اس نے بدتمیزی کی پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی۔ کمرے میں امی تھیں۔ امی سے کہنے لگی۔ اگر ہمارے اخراجات پورے کرنے کو آپ کے پاس پیسے نہ تھے تو ہمیں پیدا کیوں کیا؟ یا پھر پیدا ہوتے ہی گلا کیوں نہ گھونٹ دیا......امی پہلے تو دیکھتی رہ گئیں اور پھر ان کے آنسو بہنے لگے...... میں وہاں کچھ بھی نہ کر پا رہی تھی کہ چھوٹی بہنیں بھی اسی کی ہم زبان تھیں۔ نہ جانے ایسی ناشکری ہمارے گھر میں کہاں سے داخل ہو گئی۔ اسی وجہ سے کل آ نہ سکی اور آج بھی ذہن انہی باتوں میں گھوم رہا ہے''۔

بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر رونے لگی کہ مس نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ''میری بچی یہ مسئلہ صرف آپ کے گھر کا نہیں۔ ہمارے ہر گھر میں اس مسئلہ نے ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ یہ مسئلہ ہماری تہذیب کا ہے بھی نہیں یہ مغرب کا پیدا کردہ ہے۔ مغرب نے مال و دولت اور سرمایے کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ اس نے مادے کو خدا بنانے کا عمل تین صدیوں میں مکمل کیا ہے۔ اب مغرب کا مرکز کعبہ و قبلہ مادہ، سرمایہ اور مال ہے اور مادے کی حرص و ہوس کے سوا کوئی قدر نہیں کوئی اخلاقیات نہیں۔ دولت حاصل ہو، کیسے کس ذریعے سے، کتنا خون بہا کر کتنی آگ برسا کر، کتنوں کو زہر پلا کر اس سے اسے کوئی غرض

نہیں تمہیں معلوم ہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا علمبردار امریکہ ہے۔ جب اسے معاشی انحطاط سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ دوممالک کولڑانے کا سامان کرتا ہے۔ جس سے اس پورے خطے میں اسلحہ کی مانگ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی معیشت کی رکتی گاڑی انسانوں کے بہتے خون کے پٹرول سے چل پڑتی ہے۔ اسی تہذیب کی کرشمہ سازی ہے کہ ان کے ہاں ایک استاد اور طوائف برابر کے درجے میں ہیں کہ وہاں شراب سازی اور دوا سازی میں کوئی فرق نہیں۔ بوڑھے والدین بوجھ ہیں کہ وہ کوئی مادی فائدہ نہیں دے سکتے۔ لہٰذا بے فائدہ عنصر کو زہر کے انجیکشن سے ہٹانے کے منصوبے ہیں۔ اولاد بوجھ ہے کہ وہ مادی فائدہ دینے کے قابل نہیں۔ رشتے ناطے کسی کی بھی تو حیثیت نہیں وہاں۔

انہیں اسلام سے دشمنی ہے کہ ان کی گرتی تہذیب کو صرف اسی سے خطرہ ہے۔ اسی میں سسکتی انسانیت کے زخموں کا مرہم ہے۔ ان کے مسائل کا حل اور ان کے درد کا درماں ہے۔ دنیا کی قیادت کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں حجاب کا دو گز کپڑا بھی برداشت نہیں ہوتا اور اس پر قانون بننے لگتا ہے۔ انہیں امت مسلمہ کا قلعہ گھر اور خاندان کھٹکتا ہے۔ یہاں کا عفت و عصمت کا نظام برداشت نہیں ہو پاتا۔ ان سب سے نبرد آزما ہونے کے لئے انہوں نے خصوصی منصوبہ بندی کی ہے۔ خاص الخاص ایجنڈا تشکیل دیا ہے۔ میڈیا اور معیشت پر کنٹرول کے ساتھ ایمان، حب رسول اور جہاد کو نشانے پر لیا ہے۔ گھر اور خاندان کی تار پود بکھیرنے کا سامان کیا ہے۔ ہماری اقدار کو نشانہ بنایا ہے۔ فحاشی اور بے حیائی کو داخل کیا ہے۔ رشتہ وہی قبولیت پاتا ہے جو گاڑی بنگلہ کا مالک ہے۔ بیوی کے نزدیک اچھے شوہر کی پہچان یہ ہے کہ وہ اعلیٰ شاپنگ سینٹرز میں شاپنگ کرائے۔ ہوٹلنگ اور لمبی ڈرائیو جیسی عیاشی کرائے۔ اولاد وہ اچھی ہے جو سب سے زیادہ کمائے۔ عزت دار وہ ہے جو بچوں کو اعلیٰ مغربی اداروں میں تعلیم دلائے۔ والد وہ اچھا ہے جو سونے کا نوالہ کھلائے۔ پیشہ وہ اچھا جو تعیشات کے حصول کے لئے جیب کو خوب بھاری کرے۔ اخلاقی اقدار کی اہمیت باقاعدہ پلاننگ سے کم کی جا رہی ہے۔ وکالت، طب حتیٰ کہ تعلیم تک تجارت بننے کو ہے۔ استاد اور شاگرد کا تعلق بھی پیشہ ورانہ ہوتا جا رہا ہے کہ ایک بچہ کہتا ہے کہ استاد مجھے علم دینے کا پابند ہے اس لئے کہ عوض میں میرے والدین، اسے (pay) کرتے ہیں۔ انسانوں کے پاس جیتے جاگتے انسانوں کو دینے کے لئے وقت نہیں ہاں کتوں اور بلیوں سے قربت بڑھانے کے لئے وقت ہی وقت ہے۔ ہمارے ہاں بھی اولڈ ہاؤس اور ڈے کیئر سینٹر رواج پانے لگے ہیں۔ عورت جسے مغرب نے مادیت پرستی کے تحت اس کی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے نکال باہر کیا تھا، اب ہماری عورتوں کو بتاتے ہیں کہ گھر تمہارے لئے قید خانہ ہے اور اسے مال مفت کی حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ نکاح کو قید اور بچوں کو بوجھ بنانے کا فلسفہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے۔

عفیفہ حیرت سے نگاہیں جمائے مس کی باتیں سنتی جا رہی تھی۔ مس پھر سے گویا ہوئیں۔ میری بچی ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے ان دو چیزوں کو چھوڑ دیا جنہیں ہمارے نبیؐ نے گمراہی سے بچنے کا ضامن بتایا تھا، یہ بات معاشرے کو باور کرانے کی ضرورت ہے کہ اسلام میں مال، دولت، سرمایہ زندگی کا جز ہے۔ دیگر بہت سے اجزا کی طرح، رشتے، خاندان، اخلاق، مروت، انفاق، قناعت، رحم دلی، درد، محبت، احساس، اپنائیت، اخلاص، سخاوت، شکرگزاری، خدمت، صبر اسکی قدریں ہیں۔ خود نبی آخر الزماںؐ ایک بڑی سلطنت کے سربراہ ہوتے ہوئے بھی چٹائی پر سوتے ہیں کہ چٹائی کے نشانات بدن مبارک پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کپڑوں پر پیوند لگا لیتے ہیں۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی خادمہ کی درخواست پر انہیں تسبیحات سکھاتے ہیں۔ چند درہم تقسیم سے رہ جاتے ہیں تو پوری رات اس بے چینی میں بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے گھر کتنے ہی دن ایسے گزرتے ہیں کہ چولہوں میں آگ نہیں جلتی لوگوں کے پیٹ پر بھوک سے ایک پتھر بندھا ہے تو ان کے پیٹ پر دو پتھر ہیں۔ جہاں انفاق میں دی گئی مٹھی بھر کھجوروں کو مال و دولت کے ڈھیر پر ڈال کر اخلاص اور جذبے کی قدر کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین کی زندگیاں بزبان حال گواہی دیتی ہیں کہ وہ مال و دولت سے بھاگنے والوں کے قبیل سے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز کو جان کنی کی حالت میں

احساس دلایا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی اولاد کو مفلس چھوڑ کر غلط کیا۔ شدت جذبات میں وہ بیٹھ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ اگر میری اولاد اللہ کی مطیع ہے تو اللہ ان کے لئے کافی ہے، اور اگر اللہ کی نافرمان ہے تو مجھے ان کی پرواہی نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں ''اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں۔'' احیاء العلوم میں امام غزالیؒ ایک حدیث ذکر کرتے ہیں ''تمہارے بعد عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو طرح طرح کی خوش ذائقہ غذائیں کھائیں گے، عمدہ گھوڑوں پر سواری کریں گے، حسین و جمیل عورتوں سے نکاح کریں گے اور انواع واقسام کے خوبصورت لباس زیب تن کریں گے، ان کے پیٹ نہ بھریں گے۔ ان کے نفس زیادہ پر قناعت نہ کریں گے، وہ دنیا کے ہو کر رہ جائیں گے۔ اسی میں لگ کر صبح و شام کریں گے۔ اپنے معبود حقیقی کے بجائے اسی کو اپنا رب بنائیں گے۔ اسی پر ان کی انتہا ہوگی۔ اپنی خواہش کے متبع ہوں گے۔ تمہارے بعد اور ان کے پیچھے آنے والوں میں سے جس شخص کو ایسا زمانہ ملے اسے محمدؐ بن عبداللہ کی قسم ہے کہ وہ انہیں سلام کرے نہ ان کے مریضوں کی عیادت کرے نہ ان کے جنازوں کی مشایعت کرے نہ ان کے بڑے کی تعظیم کرے اور اگر کسی نے ان میں سے کچھ کیا تو اس نے اسلام کی (پر شکوہ عمارت) کو ڈھانے پر مدد کی۔'' ترمذی کی ایک حدیث ہے۔ ''بکریوں کے گلے میں اگر دو خونخوار بھیڑیئے چھوڑ دیئے جائیں اس میں اتنا فساد برپا نہیں کرتے جتنا فساد مرد مسلمان کے دین میں شرف، مال اور جاہ کی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ میری بچی! سرمائے اور دولت کی دوڑ نہ ختم ہونے والی دوڑ ہے۔ مسلم و بخاری کی ایک حدیث ہے۔ ''اگر انسان کے لئے سونے کے دو جنگل ہوں تو وہ ان کے پیچھے تیسرے کی جستجو کرے۔ ابن آدم کا پیٹ صرف مٹی سے بھر سکتا ہے۔'' اللہ رب العزت نے انسان کا رزق اس کے پیدا ہونے سے پہلے لکھ دیا ہے۔ وہ بے وقوف ہے کہ پھر بھی اسی لکھے کے پیچھے اوقات برباد کرتا ہے۔ اور ہدایت جو مانگنے سے ملتی ہے اس کے معاملے میں لاپروائی برتتا ہے۔ دنیا میں جو لوگ مال کے پیچھے دوڑے قرآن کریم خود ان کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ وہ سب مال و دولت ان کے پیچھے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

مس آپ کی باتوں سے میری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمیں ملت اسلامیہ کو خبردار کرنا ہوگا۔ بچانا ہوگا۔ ورنہ یہ فتنہ ہر سو جلا کر راکھ کر دے گا۔ عفیفہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر بولی۔

ہاں بیٹا یہ کام ہم پر فرض ہے کہ ہم امت کو خبردار کریں۔ انہیں قرآن و سنت کے قریب لائیں۔ انہیں بتائیں کہ تم پر ڈاکو حملہ آور اس لئے ہیں کہ اصل خزانہ تمہارے پاس ہے۔ اور بیٹا یہ کام کئے بغیر چارہ بھی نہیں کہ اللہ کا اصول ہے کہ جاننے والے جب اپنا فرض پورا نہ کریں تو ان کو سزا دی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا......''

عفیفہ آفس سے واپسی پر سوچ رہی تھی کہ اب اس کا مسئلہ ایک بڑے کینوس پر منتقل ہو گیا ہے......اسی نے احساس ذمہ داری کو بڑھا دیا ہے......اسے راہ عمل صاف دکھائی دے رہی تھی۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ

☆......☆......☆

یہ تو چلتی ہے تجھے......

فریدہ خالد

پڑھائی کے سلسلے میں انگلینڈ آتے ہوئے میں نے صائمہ اسما صاحبہ کو ایک ایس ایم ایس کر کے انفارم کیا کہ اب میرے لیے بتول میں لکھنا کچھ عرصے کے لیے مشکل ہوگا۔ مگر جواب ملا کہ اپنے تجربات، حالات اور واقعات لکھ کر بھیج دینا۔ سو وہی حاضر خدمت ہے۔

انگلینڈ آتے ہی میری ساری توجہ اس بات پر تھی کہ یونیورسٹی آنے جانے کا راستہ جلد از جلد سیکھ لوں تا کہ کلاسز شروع کرتے ہی اکیلے آ جا سکوں۔ لہٰذا روزانہ اپنی بہن کے ساتھ بس کا سفر کرنے کے لیے گھر سے نکل جاتی تھی کیونکہ بس سسٹم انگلینڈ میں کافی اچھا اور سستا (اسٹوڈنٹ ڈسکاؤنٹ) ہے۔ اس لیے شروع شروع میں کافی مزہ آتا رہا اور گھر سے دو بسیں بدل کر جانا اچھا لگتا رہا۔

ستمبر کے آغاز ہی میں یہاں کافی سردی محسوس ہوئی لیکن مجموعی طور پر موسم خوش گوار تھا۔ بہرحال جلد ہی میں بس سسٹم سے آشنا ہوگئی اور انٹروڈکشن ویک کے شروع ہوتے ہی میں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ میرے لیے اس ویک میں جانا ضروری نہ تھا لیکن میں اپنی عادت ڈالنے کی غرض سے جاتی رہی اور مزے لیتی رہی۔ بہرحال اس ویک کے فوراً بعد ہی کلاسز کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلی کلاس کے دن ہی صبح سویرے ہی سے بارش اور سردی کا آغاز ہوگیا۔ دراصل سردی میں کہیں آنے جانے کا تصور ہی میرے لیے بڑا پریشان تھا لیکن مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق جانا ہی پڑا۔

اگلے دن بھی موسم ایسا ہی رہا۔ تیسرے دن میری کلاس نہ تھی اس لیے جانا ضروری نہ تھا لہٰذا میں نے رات ہی کو سوچ لیا کہ میں ایسے خراب موسم میں نہ جاؤں گی۔ صبح اٹھی تو دیکھا کہ موسم بہت اچھا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا اسی طرح پورا ہفتہ سورج کی خوبصورت روشنی اور ہلکی پھلکی سردی میں گزر گیا۔ میں خوش تھی مگر یہ کیا منگل (میری کلاسز صرف منگل اور بدھ ہی کو ہوتی ہیں) آتے ہی بارش اور سردی شروع ہوگئی اور میں پریشان حال کلاس میں جاتی رہی لیکن جیسے ہی کلاس کے دن ختم ہوئے سورج پھر اپنی آب و تاب دکھانا شروع ہوگیا۔

اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ چوتھے ویک میں تو حد ہی ہوگئی مجھے منگل کو صبح جلدی جانا تھا اور موسم انتہائی خراب ہوگیا۔ دل چاہا کہ نہ جاؤں مگر جانا لازمی تھا۔ سونے پر سہاگہ اسی دن اچانک مجھے ایک کیمپس سے دوسرے کیمپس جانے کی ضرورت ہوئی موسم ٹھنڈا ہونے کے ساتھ ساتھ بارش بھی شروع تھی۔ دل کڑا کر کے جو باہر نکلی تو تھوڑی ہی دور جانے کے بعد اولے پڑنے شروع ہوئے اور ایسے زوردار طریقے سے پڑے کہ میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میں نے بھاگ کر قریبی بلڈنگ میں پناہ لی۔ میں گھر جانے کی فکر میں تھی لیکن ابھی اگلی کلاس اٹینڈ کرنا باقی تھا۔ خدا خدا کر کے وقت گزرا اور بارش تھمی۔ گھر واپس آتے ہوئے خوش تھی کہ اگلے دن کلاس نہ تھی اور میں گھر ہی میں اپنا کام کر سکتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اب سردی شروع ہوگئی ہے۔ لیکن صبح اٹھی تو حیران رہ گئی سورج اپنی پوری آب و تاب کیساتھ دن بھر چمکتا رہا۔ یکا یک مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آیا۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

اور یقین کریں کہ اس شعر کا مفہوم بھی پہلی مرتبہ ہی سمجھ آیا۔ واقعی جب ہوائیں تیز چلتی ہیں اور بادل برسنے کو بیتاب ہوتے ہیں تو جہاں تمام پرندے اپنے محفوظ ٹھکانوں کی طرف رخ کرتے ہیں وہیں عقاب بادلوں سے اوپر کی طرف اڑتا ہے تا کہ بارش اور تند ہوائیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

اس شعر کے ذہن میں آتے ہی جیسے میں مطمئن ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں قرآن کی سورہ الم نشرح کی آیات آگئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے پس تنگی کے ساتھ آسانی ہے، بیشک تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔

مولانا وحیدالدین کتاب زندگی صفحہ ۴۵ میں لکھتے ہیں کہ گنے کا رس نکالنے کے لئے جب اسے ایک روائتی قسم کے کولھو میں ڈالا جاتا ہے تو اس پر کم دباؤ پڑتا ہے اور کم رس نکلتا ہے لیکن جب گنے کو بجلی سے چلنے والے کرشر میں ڈالا جاتا ہے تو اسے چار مرتبہ مشینی بیلن کے درمیان سے گزارا جاتا ہے اس طرح اس پر زیادہ دباؤ ڈالا جاتا ہے اور گنے کا تمام رس نکالا جاتا ہے۔ اس مثال سے وہ اللہ کا یہ قانون سمجھاتے ہیں کہ انسان کے اندر چھپے امکانات اسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب وہ دباؤ کا شکار ہو جب اس کی شخصیت کو نچوڑنے والے عمل سے گزارا جائے اور یہ کہ تاریخ میں بڑی ترقی پانے والے وہی لوگ تھے جنھوں نے **انّ مع العسر یسرا** کا حقیقی راز کو پایا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ انسانی نگاہ مشکل کو مشکل کے روپ میں دیکھتی ہے جب کہ ربانی نگاہ وہ ہے جو مشکل کو آسانی کے روپ میں دیکھنے لگے۔ (ص:۴۵) بس اس مضموں کو پڑھ کر قرآن سے حکمت کی جو بات میری سمجھ میں آئی وہ یہی تھی کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

☆......☆......☆

ہر سوٗ راج کرے اندھیرا

مہرین اقبال راؤ۔ لاہور

بے حس دل اور مردہ چہرے
اندھی بستی، بہرے لوگ
ہر اک اپنے دکھ کو روئے
سکھ مانگے اور کانٹے بوئے
ہر سو راج کرے اندھیرا
حق ماریں اور چوٹ لگائیں
حق حق کرنے والے لوگ
اک دوجے کی پگڑی کھینچیں
رب رب کہنے والے لوگ
ہر سو راج کرے اندھیرا
بے ساکھی سے چلنے والے
اونچے تگڑے کاہل لوگ
کا ہے اپنی جان کھپانا
گونگے، بہرے، جاہل لوگ
ہر سو راج کرے اندھیرا

☆......☆......☆

UPTO 50% سیل

بنت حوا۔ جدّہ

بھئی بات سنیں! ''سٹی میکس''، ''سنٹر پوائنٹ'' اور ''ریڈ ٹیگ'' پر 50% سیل لگی ہوئی ہے۔ کیا خیال ہے، اس ویک اینڈ پر ہم بھی چلیں......؟

ہم نے میاں کا خوشگوار موڈ دیکھتے ہی پوچھا۔

اچھا...... ہماری بیگم بھی آج کل بڑی خیر خبر رکھنے لگی ہیں...... اچھا کو خوب لمبا کرکے۔

انہوں نے گویا ہماری ''باخبری'' کی وجہ جاننا چاہی۔

''نہیں جی۔ خیر خبر کہاں؟ آپ تو جانتے ہیں۔ میں نہ تو فضول خرچ ہوں اور نہ ہی دنیا دار عورتوں کی طرح بازار میں پھرنے کی رسیا۔ بس یونہی کچھ دوستوں کو کہہ رکھا تھا کہ سیل لگے تو مجھے ضرور بتانا۔ اچھی کوالٹی کی چیز کم قیمت میں مل جائے گی۔ سال بھر سکون سے گزر جائے گا۔'' اب کی دفعہ وہ خاموش ہی رہے، شاید وہ ہمارے ان مکالموں کے عادی ہو چکے تھے۔

پھر ہوا یہ کہ...... ایک ویک اینڈ کیا...... جب تک سیل لگی رہی، کبھی میاں کے ساتھ، کبھی بچوں کے ساتھ اور کبھی دوست کے ساتھ کئی چکر لگا آئے۔ اور یوں وہ UP to 50% سیل ہمیں 200% مہنگی پڑ گئی۔ کہاں تو ہمیں لینا کچھ نہیں تھا اور کہاں یہ کہ اچھے برانڈز کے کپڑے کہیں

آدھی اور کہیں آدھی سے بھی کم قیمت پر مل رہے ہیں۔تو سوچا پھر کہاں ایسی سیل ملے گی، چلو سب بچوں کے چار پانچ سوٹ لے لوں۔کچھ ناپ سے بڑے کپڑے اس لئے اٹھا لئے کہ اگلے موسم میں یا اگلے سال کام آ جائیں گے۔ پاکستان بھی سال ڈیڑھ تک جانا ہے، جتنے تحائف لے سکوں، اسی سیل سے لے لوں۔ہاں اصلی ٹیگ ہی لگے رہنے دوں گی، کیا ہوا جو 35 ریال کی کاٹن شرٹ 10 میں مل گئی۔ لینے والا تو یہی سمجھے گا کہ ناں کہ اتنا مہنگا سوٹ اس کے بچے کو دیا ہے۔واہ وا یہی تو ہے ناں بچت! خیالوں ہی خیالوں میں اپنی دور اندیشی کو سراہا۔ کچھ New born کے کپڑے بہت ہی سستے مل رہے تھے۔ادھر اُدھر ذہن دوڑایا، خاندان اور دوستوں میں ایک آدھ ہی ''نیا بچہ'' تھا۔سوچا لے کر رکھ لیتی ہوں۔کوئی تو دنیا میں آ ہی جائے گا۔

زندگی خدا جانے کتنی ہے مگر ہم نے دو سال کا سٹاک بھی جمع کر لیا اور بچت کی بچت۔ہم کہاں اصل قیمتیں افورڈ کر سکتے ہیں۔سیانے اسی کو تو کہتے ہیں کہ ''کم خرچ بالانشین.....'' کیا ہوا جو وقتی طور پر جیبیں خالی ہو گئیں۔الماریاں تو بھر گئیں۔ بڑی مشکل سے سب کچھ ٹھکانے لگا کر، ٹھونس ٹھانس کر اطمینان کا سانس لیا۔ چند ماہ بعد ہی ایک روز ہم کہہ رہے تھے۔

''سنا ہے ''سٹی میکس'' وغیرہ پر سیل لگی ہے بڑی زبردست۔آفس سے جلدی آ جیئے گا۔ سال بھر کے کپڑے لے لیں گے۔ بڑی آسانی رہتی ہے اور بچت کی بچت!''

☆......☆......☆

پشتے مضبوط کریں

فرحانہ عمر چودھری۔ملتان

جہاں تم چومتی تھی ماں وہاں تک آ گیا تھا وہ۔نجانے ہم سانحات کو فراموش کرنے میں کس حد تک چلے گئے ہیں ہم تو کسی بھی نقصان کی تلافی نہیں کر پائے تھے کہ دشمن نے ایک بار پھر ہم پر اتنا بڑا چرکہ لگایا کہ جس کے گھاؤ شاید ہی کبھی بھر سکیں۔

اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ زمانہ طالبعلمی میں ہمارا ایک وفد چینی راہنما ماؤزے تنگ سے ملا۔اپنی باری آنے پر میں نے ماؤزے صاحب سے فرمائش کی کہ مجھے کوئی بڑی بات کہیں جو من حیث القوم ہمارے لئے نافع ہو۔ماؤزے صاحب نے اپنی نیم وآنکھیں پوری طرح کھولیں اور کہا کہ جن پانیوں کے پشتے اندر سے مضبوط ہوتے ہیں بیرونی لہریں اور طوفان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' اشفاق احمد کہتے ہیں کہ اس وقت مجھے یہ بات معمولی محسوس ہوئی۔لیکن بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس عظیم رہنما کی سوچ میں کس قدر گہرائی تھی۔کس قدر اخلاص تھا اگر یہی اخلاص اور بصیرت ہمارے حکمرانوں میں آ جائے تو شاید اس ملک کی تقدیر بدل جائے۔قیام پاکستان کے چند برس بعد ہی اگر یہ معاملات ایک غیر ملکی رہنما کی نظر میں آ رہے تھے تو آج تک ہماری نظروں میں کیوں نہیں آ سکے؟

☆......☆......☆